مخدوم۔ شاعرِ نبض شناس

مدیر

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ڈپٹی ڈائرکٹر و انچارج مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

Maulana Azad National Urdu University

Gachibowli, Hyderabad - 500 032 گچی باؤلی، حیدرآباد

مخدوم۔ شاعرِ نبض شناس

مدیر

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ڈپٹی ڈائرکٹر و انچارج مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت

© جملہ حقوق بحق مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد محفوظ

سلسلہ اشاعت۔ ۴

کتاب : مخدوم۔شاعرِ نبض شناش

اشاعت : مئی 2008

تعداد : تین سو (300)

ناشر : ڈاکٹر پی پرکاش، رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

مدیر : ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد
ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج، مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

کمپوزنگ و طباعت: امپریشنس کوالٹی پرنٹرس، حیدرآباد

معاونین : آمنہ انجم
محمد وسیم راجہ

ملنے کا پتہ : مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد 032 500
فون نمبر۔ 040-23008359/60

Makhdoom : Shair-e-Nabz Shanas

Publisher
Dr. P. Prakash
Registrar, MANUU

Editor
Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed
Dy. Director & I/c, Centre For Urdu Language, Literature & Culture
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

سرپرست اعلیٰ

پروفیسر اے ایم پٹھان، وائس چانسلر

سرپرست

پروفیسر کے آر اقبال احمد، پرووائس چانسلر

پبلیشر

ڈاکٹر پی پرکاش، رجسٹرار

مدیر

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج، مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

دس سالہ جشن یوم تاسیس

دعوت نامہ

ایک روزہ قومی سمینار

''مخدوم۔شاعر نبض شناس''

زیر اہتمام

مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

دس سالہ جشن یوم تاسیس

''مخدوم۔شاعر نبض شناس''

ایک روزہ قومی سمینار

زیر اہتمام

مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت

تاریخ: چہارشنبہ 23 اپریل 2008ء　　وقت: صبح 10.30 بجے

مقام : یونیورسٹی کانفرنس ہال

نظام العمل، افتتاحی اجلاس

خیر مقدمی کلمات : پروفیسر کے آر اقبال احمد
پرووائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیشکشی نذرانہ گل ویادگاری تحفہ : بدست پروفیسر اے ایم پٹھان
وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

افتتاحی کلمات : پروفیسر محمد شمیم جے راجپوری
بانی وسابق وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

صدارتی خطاب : پروفیسر اے ایم پٹھان، وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

کلمات تشکر : ڈاکٹر پی پرکاش، رجسٹرار، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

کنوینر : ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد، ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج، مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

*** وقفہ برائے چائے ***

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

دس سالہ جشن یوم تاسیس

زیراہتمام
مرکز برائے اُردو زبان، ادب وثقافت

نظام العمل

ایک روزہ قومی سمینار

”مخدوم ۔ شاعر نبض شناس“

مقام : یونیورسٹی کانفرنس ہال، گچی باؤلی، حیدرآباد

تاریخ : چہارشنبہ ۲۳ اپریل ۲۰۰۸

وقت : صبح ساڑھے دس بجے

پہلا سیشن : 11.45 بجے دن

صدارت : پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

سابق پروفیسر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

مہمان اعزازی: **پروفیسر سیدہ جعفر،** سابق صدر شعبہ اُردو، عثمانیہ وحیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی

مقالہ نگار

- ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس، ریڈر شعبہ اُردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی
- ڈاکٹر فاطمہ پروین، ریڈر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی
- پروفیسر خالد سعید، صدر شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
- پروفیسر رحمت یوسف زئی، سابق صدر شعبہ اُردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی
- پروفیسر ایس اے وہاب قیصر، پروفیسر، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

نظامت : ڈاکٹر نکہت جہاں، ریڈر نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

*** *** ***

دوسرا سیشن : 2.00 بجے دن

صدارت : جناب مجتبیٰ حسین، نامور مزاح نگار

مہمان اعزازی: **ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، مجاہد آزادی**

مقالہ نگار

- ڈاکٹر عسکری صفدر، ریڈر و صدر شعبہ اُردو حسینی علم گرلز ڈگری کالج
- پروفیسر مجید بیدار، شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی
- پروفیسر ریحانہ سلطانہ، صدر شعبہ تعلیم نسواں وانچارج ناظم مرکز برائے مطالعات نسواں، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
- پروفیسر بیگ احساس، صدر شعبہ اردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی
- پروفیسر آمینہ کشور، صدر شعبہ انگریزی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
- پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، سابق پروفیسر، ایس وی یونیورسٹی
- پروفیسر اشرف رفیع، سابق صدر شعبہ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی
- ڈاکٹر عقیل ہاشمی، سابق صدر شعبہ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی

نظامت : **ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی،** لکچرر شعبہ اُردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

فہرست

پیامات

پروفیسر اے ایم پٹھان ۔ شیخ الجامعہ i

پروفیسر کے آر اقبال احمد ۔ نائب شیخ الجامعہ iii

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ۔ مجاہد آزادی v

اپنی بات ۔ ڈاکٹر شجاعت علی راشد ۔ مدیر vi

۱۔ شاعر نبض شناس۔مخدوم محی الدین ۔ پروفیسر محمد شمیم جے راجپوری 1

۲۔ مخدوم۔شخص و شاعر ۔ جناب محمد علی شبیر 5

۳۔ مخدوم محی الدین کی معنویت اور عصرِ حاضر ۔ پروفیسر مغنی تبسم 7

۴۔ مخدوم محی الدین (سوانحی خاکہ) ۔ جناب مجتبیٰ حسین 18

۵۔ 'فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے'۔۔مخدوم محی الدین ۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی 30

۶۔ عصری حسیّت اور شعری صناعی کا شاعر ۔ پروفیسر سیدہ جعفر 41

۷۔ مخدوم کی شعریات اور تصور جمال ۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی 53

۸۔ شاعر شکست نور و صدا ۔ پروفیسر خالد سعید 61

۹۔ تلاش مخدوم۔ تقاضے اور تجاویز۔ پروفیسر اشرف رفیع 100

۱۰۔ مخدوم۔۔۔رجائیت کی منفرد آواز ۔ پروفیسر ایس اے وہاب قیصر 111

۱۱۔ مخدوم کی انقلابی شاعری ۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید 120

۱۲۔ یار غم گسار کی بات ۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی 134

۱۳۔ مخدوم کی شخصیت کے چند پہلو ۔ پروفیسر بیگ احساس 144

۱۴۔ مخدوم شاعر فکر و عمل۔ پروفیسر ریحانہ سلطانہ 154

۱۵۔ مخدوم کی شاعری میں پیکر تراشی ۔ پروفیسر مجید بیدار 169

۱۶۔ مخدوم کی شاعری میں اسلامی تلمیحات و اشارات ۔ پروفیسر فاطمہ بیگم 176

۱۷۔ مخدوم کی شاعری میں اسلامی تلمیحات، روایات اور تصورات کا تفاعل۔ڈاکٹر نسیم الدین فریس 186

۱۸۔ مخدوم کی شاعری اور سماجی شعور ۔ ڈاکٹر نکہت جہاں 201

۱۹۔ مخدوم۔ لافانی شاعر ۔ ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد 211

۲۰۔ مخدوم کا شعری تخیل دور جدید کا نباض ۔ ڈاکٹر عسکری صفدر 226

۲۱۔ مخدوم اور فلسفۂ مارکسزم ۔ ڈاکٹر آمنہ تحسین 239

۲۲۔ کمان ابروئے خوباں کا بانکپن اور مخدوم محی الدین ۔ ڈاکٹر فیروز عالم 251

۲۳۔ ''تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے'' ۔ محترمہ عائشہ صدیقہ شاداں 262

رپورتاژ

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید 270

جناب مجتبیٰ حسین 277

۲۴۔ Makhdoom- As a minimalist poet - Prof. Amina Kishore 288

۲۵۔ Message - Dr. P. Prakash 289

پروفیسر اے ایم پٹھان

شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

پیام

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے یوم تاسیس کے دس سالہ جشن کے سلسلہ میں یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان ،ادب و ثقافت کے زیر اہتمام 23اپریل2008 کومنعقدہونے والے ایک روزہ قومی سمینار ''مخدوم شاعرنبض شناس'' میں پڑھے جانے والے مقالہ جات اور 24اپریل2008 کومنعقدہ ''ایک شام مخدوم کے نام'' شام نغمہ کی روئیداد کی کتابی شکل میں اشاعت کے لیے میں اپنی اور یونیورسٹی کی جانب سے مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کے تمام اراکین کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اسکالرس کو مخدوم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کوایک نئے انداز سے دیکھنے اور پرکھنے کے مواقع فراہم کرے گی جس سے فکروعمل کی نئی راہیں روشن ہوں گی۔ کیوں کہ مخدوم محی الدین سرزمین دکن

کے مایہ ناز سپوت غریبوں کے مسیحا اور ہردلعزیز شاعر تھے جو لڑکپن ہی سے اشتراکی نظریات سے متاثر تھے 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد ہندوستان کے پڑھے لکھے نوجوان اشتراکی نظریات کے گرویدہ ہوگئے ۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں انجمنیں قائم ہونے لگیں چناں چہ حیدرآباد میں بھی ترقی پسند مصنفین کا ایک حلقہ قائم ہوا۔ مسز سروجنی نائیڈو اس حلقہ کی سرپرست تھیں اور مخدوم محی الدین ایک سرگرم کارکن ۔ مسز سروجنی نائیڈو ہی نے ملک کے اہم سیاسی لیڈروں سے مخدوم کا تعارف کروایا۔ ان دنوں تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی چناں چہ قومی لیڈروں سے ملاقات نے مخدوم کو ایک نیا حوصلہ عطا کیا اور وہ ایک مستحکم عزم کے ساتھ جدو جہد آزادی میں شامل ہوگئے ۔ حالاں کہ ان دنوں مخدوم سٹی کالج حیدرآباد میں لکچرر تھے۔ ان کا کلام دوسرے شعراء کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے لیکن اس کے باوجود مخدوم نے جتنا بھی لکھا وہ ان کی ابدی شہرت کے لیے کافی ہے۔ میں ایک بار پھر سے مرکز برائے اردو زبان، ادب وثقافت کے انچارج اور اس کتاب کے مدیر ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد اور ان کے رفقا کو سمینار اور تہذیبی پروگرام کے کامیاب انعقاد اور اس کتاب کی اشاعت کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔

دستخط

پروفیسر کے آر اقبال احمد

نائب شیخ الجامعہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

پیام

مخدوم کی زندگی پر سرسری ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ 1937 میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے بعد وہ سٹی کالج حیدرآباد میں اردو کے لکچرر ہوئے۔ یہ ملازمت دو سال تک برقرار رہی۔لیکن مخدوم اس ملازمت سے استعفیٰ دے کر کمیونسٹ پارٹی کے ہمہ وقتی رکن بن گئے۔ 1944 میں ان کا پہلا مجموعہ ''سرخ سویرا'' منظر عام پر آیا جس میں مخدوم ایک سیاسی کارکن نظر آتے ہیں۔ان کی نظمیں عوام میں مقبول ہونے لگیں اور پارٹی کے جلسوں میں گائے جانے لگیں۔سرخ سویرا کی بیشتر نظمیں سیاسی اور سماجی موضوعات پر لکھی گئیں۔1961 میں دوسرا مگر مختصر مجموعہ کلام ''گل تر'' شائع ہوا۔اس میں انقلابی شاعری کے بعد رومانی کیفیات کا اظہار ہے جیسا کے اس دور کے دوسرے شعرا کے یہاں انقلاب اور رومان کا امتزاج نظر آتا ہے۔

مخدوم کی شاعری میں انسان دوستی اور جمالیاتی احساس کے قدر مشترک ہے۔ان کی نظمیں ایک طرف سیاسی اور سماجی شعور، جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہیں تو دوسری طرف رومان کا لطیف احساس بھی دلاتی ہیں۔

یونیورسٹی میں اس سال 9/جنوری سے جاری دس سالہ جشن یوم تاسیس کے سلسلہ میں یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت Centre for urdu Language Literature and Culture (CULLC) نے شیخ الجامعہ کو جب یہ تجویز پیش کی کہ انقلابی شاعر مخدوم محی الدین کی پیدائش کی صد سالہ تقاریب کے ضمن میں یونیورسٹی میں دو روزہ قومی تقاریب منعقد کرنے کی اجازت دیں تو شیخ الجامعہ نے اپنے عہد کے اس منفرد شاعر پر ایک روزہ قومی سمینار ''مخدوم شاعر نبض شناس'' اور ایک تہذیبی پروگرام شام نغمہ کے انعقاد کی اجازت دی۔تا کہ مخدوم جیسے انقلابی شاعر کو بھرپور خراج عقیدت و تحسین پیش کرتے ہوئے یونیورسٹی کے اس نو قائم شدہ مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کی سرگرمیوں کا آغاز ہو سکے۔اور شیخ الجامعہ نے ہمیشہ کی طرح مرکز کے اس پہلے سمینار میں پڑھے جانے والے منتخبہ مقالوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کی بھی اجازت دی ہے۔ مجھے بہت زیادہ مسرت ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کے اس نو قائم شدہ مرکز کے سرگرم اراکین نے ایک روزہ قومی سمینار ''مخدوم۔شاعر نبض شناس'' اور ''ایک شام مخدوم کے نام'' کے کامیاب انعقاد کے ذریعہ یونیورسٹی کے اس نئے مرکز کی مستحکم بنیاد رکھی ہے۔ ان دو روزہ قومی تقاریب کے کامیاب انعقاد اور ''مخدوم۔شاعر نبض شناس'' کتاب کی اشاعت کے لیے میں اس مرکز کے انچارج و ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر شجاعت علی راشد اور ان کے تمام ساتھیوں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دستخط

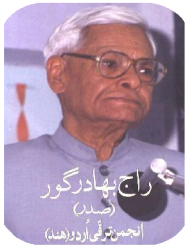

راج بہادر گوڑ ۔مجاہد آزادی

پیام

محترم پروفیسر اے ایم پٹھان، وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

تسلیم

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کی تاسیس کی دسویں سالگرہ اور مخدوم صدی سلسلے کی جو تقاریب یونیورسٹی منعقد کر رہی ہے وہ کارنامے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں کئی وجوہات کی بناء پر حاضر ہونا چاہتا تھا۔

۱۔مولانا آزاد یونیورسٹی کی یوم تاسیس ۲۔مخدوم پر سمینار، مخدوم شاعر نبض شناس

مگر اپنی بیماری کی وجہ سے اپنے چنبیلی کے منڈوے میں ہی محصور رہا، اور سمینار سے محروم رہا۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کا حیدرآباد میں قیام اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ حیدرآباد کا اُردو کی ترقی میں ایک اہم حصہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی کیونکہ دکنی زبان کا ارتقاء اور محمد قلی قطب شاہ کے کارنامے حیدرآباد کے لیے خاص طور سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حیدرآباد کو دکنی اُردو میں اولین دیوان (کلیات محمد قلی قطب شاہ) کو شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دکنی زبان کے ارتقاء اور تاریخ کو بڑھاوا دینے کا یہ فرض حیدرآباد ادا کرتا رہا ہے۔ اور آج یہ عصری اُردو کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔

بہرحال آپ نے سمینار اور جشن منعقد کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں آپ کی دعوت کا مشکور ہوں اور حاضر ہونے سے مجبور ہوں میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

نیاز مند

راج بہادر گوڑ

اپنی بات

انسانی تاریخ میں شاعری کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں شاعری کو دلچسپی و پسندیدگی کا درجہ دیا گیا۔ بقول مخدومؔ

بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چن کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغموں سے ایک اپنا گیت بناتا ہوں
فردوسِ خیالی میں بیٹھا اک بت کو تراشا کرتا ہوں
پھر اپنے دل کی دھڑکن کو پتھر کے دل میں بھرتا ہوں

شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ شاعر بحیثیت ایک فردِ معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے۔ شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوع انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ہر دل عزیز شیخ الجامعہ پروفیسر اے ایم پٹھان نے ایک ترقی پسند شاعر مخدوم کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے یونیورسٹی کے نو قائم کردہ مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کو یونیورسٹی کے دس سالہ جشنِ یومِ تاسیس کے پر مسرت موقع پر مخدوم محی الدین کی پیدائش کی صدی تقاریب کی مناسبت سے دو روزہ قومی تقاریب کے انعقاد کی اجازت دی تو راقم نے ایک روزہ قومی سمینار ''مخدوم شاعرِ نبض شناس'' اور ایک شام مخدوم کے نام سے شامِ نغمہ کے انعقاد کی تجویز پیش کی۔ شیخ الجامعہ نے ان تقاریب کے شایانِ شان انعقاد کے لیے نہ صرف یہ کہ تمام تر سہولتوں کی فراہمی کو یقینی بنایا بلکہ یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کے پہلے ایک روزہ قومی سمینار ''مخدوم شاعرِ نبض شناس'' کے افتتاح کے لیے یونیورسٹی کے بانی و سابق وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جے راج پوری کو بحیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کرنے کے علاوہ اس سمینار میں شرکت کے لیے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی سابق ڈین و صدر شعبہ اردو جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی اور دونوں شہروں حیدرآباد و سکندرآباد کی جامعات سے تعلق رکھنے والے اردو دنیا کے نمائندہ اسکالرس کو بھی مدعو کرنے کے اجازت دی اس طرح محنت و محبت کے شاعر مخدوم محی الدین کو خراج پیش کرنے کے لیے منعقدہ اس ایک روزہ سمینار میں پیش کردہ مقالہ جات کو شیخ الجامعہ پروفیسر ایم پٹھان کی رہنمائی اور منظوری کے باعث کتاب کی شکل میں آپ قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کے زیر اہتمام شائع کی جانے والی اس پہلی کتاب میں سمینار میں پیش کردہ مقالہ جات کے علاوہ ان منتخبہ مقالوں کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے جنہیں تنگیِ وقت کے باعث مذکورہ بالا **سمینار** کے نظام العمل میں شامل نہیں کیا جاسکا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ پروفیسر آمنہ کشور صدر شعبہ انگریزی کی جانب سے اس سمینار میں پیش کیا جانے والا مقالہ Makhdoom - As

"a minimalist poet" جو کہ اس سمینار میں انگریزی کا واحد مقالہ تھا شرکاء سمینار کی آراء کا احترام اور ماضی قریب کی روایتوں کو برقرار رکھتے ہوئے اس کتاب کے آخر میں انگریزی زبان ہی میں شامل کیا گیا ہے ۔

بہر حال شیخ الجامعہ پروفیسر اے ایم پٹھان، نائب شیخ الجامعہ پروفیسر کے آر اقبال احمد، رجسٹرار یونیورسٹی ڈاکٹر پی پرکاش، فینانس آفیسر جناب سی ایم ایشورایا، پروفیسر محمد شمیم جے راجپوری سابق وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی سابق ڈین جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی، پروفیسر سیدہ جعفر سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ و حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی اور نامور مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین اور سمینار کے تمام شرکاء اور تمام مقالہ نگاروں کا میں یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان ادب و ثقافت کی جانب سے صمیم قلب کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ساتھ ہی میں مرکز کے اس پہلے اور انتہائی کامیاب ترین دو روزہ قومی پروگرام کے انعقاد کے لیے اپنا عملی تعاون دینے والے مرکز کے اراکین محترمہ عائشہ صدیقہ، جناب ذاہد علی انصاری اور جناب محمد وسیم راجہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ڈاکٹر نکہت جہاں ریڈر نظامت فاصلاتی تعلیم کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ اس کتاب کی تزئین و ترتیب میں بھرپور تعاون عمل پیش کرتے ہوئے انہوں نے اس کتاب کو آپ قارئین تک پہنچانے میں ہماری مدد کی۔ اس یقین کے ساتھ یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے کہ آپ قارئین بھی اسے اپنی پسندیدگی کی سند عطا کریں گے۔

مدیر

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ڈپٹی ڈائرکٹر و انچارج' مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت

پروفیسر شمیم جے راجپوری

بانی وسابق شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

شاعرِ نبض شناس ۔ مخدوم محی الدین

پروفیسر پٹھان صاحب نے جب مجھ سے یونیورسٹی کے دس سالہ جشن تاسیس کے موقع پر حیدرآباد کے ایک انقلابی شاعر مخدوم محی الدین کی پیدائش کی صد سالہ تقاریب کے ضمن میں منعقد کیے جانے والے ایک روزہ قومی سمینار کے افتتاح کے لیے مدعو کیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اردو یونیورسٹی حال کے ساتھ ساتھ اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں کو بھی نئی نسل تک پہنچانے کا فریضہ بخوبی نباہ رہی ہے۔ میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کو اس سمینار اور اس سلسلہ میں منعقد ہونے والی تقریب ''ایک شام مخدوم کے نام'' کے انعقاد کے لیے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں مجھے یقین ہے کہ پروفیسر پٹھان صاحب کی سرپرستی میں یونیورسٹی کے تمام شعبہ جات ہمارے اسلاف کے کارہائے نمایاں کو آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے اس طرح کی تقاریب کا آئندہ بھی انعقاد عمل میں لائیں گے۔ بہرحال مخدوم محی الدین کی پیدائش کی صد سالہ تقاریب کے موقع پر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کے زیر اہتمام دو روزہ قومی تقاریب کا اہتمام نہ

صرف یہ کہ خوش آئند ہے بلکہ ایک انقلابی شاعر کے لیے حقیقی خراج بھی۔

مخدوم محی الدین ایک مذہبی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ موضع منمول میں اس گھر کے افراد نہایت عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ اس گاؤں میں یہی تعلیم یافتہ گھرانہ سمجھا جاتا تھا۔ مخدوم 4 فبروری 1908ء کو ضلع میدک کے گاؤں اندول میں پیدا ہوئے۔ مخدومؔ ابھی پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد محمد غوث محی الدین کا انتقال ہوگیا۔ ان کے چچا بشیر الدین نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ مخدوم نے 1929ء میں سنگاریڈی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال منشی کا امتحان بھی امتیازی نشانات سے پاس کیا۔ مخدوم نے وسائل کی کمی کے باوجود تعلیم جاری رکھی۔ جامعہ عثمانیہ سے 1932ء میں انٹرمیڈیٹ کیا۔ مخدومؔ کا قیام اپنے رشتے کے چچا کے پاس تھا کچھ دن کفالت کرنے کے بعد انھوں نے معذرت کرلی۔ مخدومؔ نے سخت کسمپرسی میں وہ دن گذارے۔ مخدومؔ کی شادی 22 اگست 1933ء کو ان کی چچازاد بہن رابعہ بیگم سے ہوئی۔ 1934ء میں مخدومؔ نے بی۔اے اور 1936ء میں ایم۔اے کیا۔ ایم۔اے کی تکمیل کے بعد وہ دفتر دیوانی ملکی و مال میں تھرڈ گریڈ کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ 1939ء میں مخدومؔ کا تقرر سٹی کالج حیدرآباد میں بحیثیت استاد ہوا۔ 1941ء میں مخدومؔ کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری چنے گئے تھے۔ 1943ء میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ تشکیل مخدومؔ کی رہنمائی میں عمل میں آئی۔ 1945ء میں انھوں نے ایک کل ہند کانفرنس کا اہتمام کیا جو بے حد کامیاب رہی۔ 1942ء سے 1946ء تک کا زمانہ ریاست حیدرآباد میں ایک طوفانی دور رہا۔ شہر میں ٹریڈ یونین کے سربراہ مخدومؔ، راج بہادر گوڑ، کے۔ایل مہندرا، حیدر حسن، جواد رضوی اور غلام حیدر تھے۔ 1946ء میں پارٹی نے یوم انسداد استحصال منانے کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے

ساتھ ہی حکومت نے کمیونسٹ لیڈروں کو جیل میں بھرنا شروع کیا۔ مخدومؔ نے دوسرے کامریڈوں کے ساتھ روپوشی اختیار کی۔ نظام سرکار کے خلاف کامریڈوں نے مسلح جدوجہد کا زوروشور سے آغاز کیا۔ مئی 1951ء میں مخدومؔ گرفتار کر لیے گئے۔ حصول آزادی کے بعد ملک میں پہلی بار عام انتخابات 1952ء میں منعقد ہوئے۔ مخدوم اسمبلی اور پارلیمنٹ دونوں کے لیے امیدوار تھے اپنی مقبولیت کے باوجود وہ الیکشن ہار گئے بعد میں 1956ء میں وہ قانون ساز کونسل کے امیدوار بنے اور مجلس قانون ساز آندھرا پردیش میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہوئے۔ 1954ء سے 1955ء تک مخدوم نے چین، سوویت یونین، مشرقی یورپ کے ممالک اور آفریقہ کا دورہ کیا۔ 25 اگست 1969ء کو دہلی میں مخدومؔ کا انتقال ہوا اور تدفین درگاہ حضرت شاہ خاموش کے احاطہ قبرستان حیدرآباد میں ہوئی۔

مخدومؔ طبعاً بذلہ سنج، شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ مدرسہ سے لے کر کالج تک اور کالج سے لے کر عام زندگی تک ان کی رگ ظرافت طرح طرح سے پھڑکتی نظر آتی ہے۔ مخدوم فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔ بمل رائے نے مخدوم کی نظم ''سپاہی'' کو اپنی فلم ''اس نے کہا تھا'' میں بڑی ہی موثر دھن کے ساتھ پیش کیا تھا۔ مخدوم کی نظم ''چارہ گر'' نے فلمی دنیا میں ہلچل مچادی تھی۔

مخدومؔ عہد جدید کے شعراء میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ محنت اور محبت کے شاعر ہیں ان کی شاعری کی ابتدا 1933ء کے لگ بھگ ہوئی جب وہ وہ جامعہ عثمانیہ میں بی۔اے کے طالب علم تھے۔ مخدومؔ ایک فطری شاعر تھے۔ ان کا فن اکتسابی نہیں بلکہ وجدانی تھا۔ ان کی پہلی نظم ''پیلا دوشالہ'' ہے۔ مخدومؔ کے ابتدائی کلام پر جوشؔ، اخترؔ شیرانی اور حفیظؔ جالندھری کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ جنوری 1944ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام

''سرخ سویرا'' شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے سترہ برس بعد ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''گل تر'' اگست 1961ء میں شائع ہوا۔ گل تر کی نمائندہ نظمیں چارہ گر، آج کی رات نہ جا، جانِ غزل کے علاوہ دو انگریزی نظموں کے تراجم ''فاصلے'' اور ''ہم دونوں'' قابل ذکر ہیں۔ گل تر کے بعد ''بساط رقص'' کلیات کی صورت میں ڈسمبر 1966ء میں شائع ہوا۔

مخدوم کی شہرت ان کی شاعری کی وجہ سے ہے جب کہ انھوں نے ڈرامے، مختصر افسانے اور مضامین بھی لکھے۔

میں ایک بار پھر سے پروفیسر اے۔ ایم پٹھان اور مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کے انچارج و ڈپٹی ڈائریکٹر ڈاکٹر شجاعت علی راشد اور ان کے اسٹاف کو اس سمینار کے انعقاد اور تہذیبی پروگرام ''شام نغمہ'' کے انعقاد کے لیے پرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سمینار میں پڑھے جانے والے مقالہ جات پر محیط کتاب مخدوم کی شخصیت کے کچھ اور پوشیدہ گوشوں کو بھی بے نقاب کرے گی۔

☆☆☆

جناب محمد علی شبیر
ریاستی وزیر برائے توانائی واقلیتی بہبود

مخدوم۔شخص وشاعر

مخدوم ایک ہمہ پہلوشخصیت کے مالک تھے اسی لیے ان کی شاعری اور شخصیت کو صرف ایک پہلو سے دیکھتے ہوئے مخدوم کی شخصیت کا حقیقی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔کیوں کہ جہاں مخدوم ایک بلند پایہ شاعر ہیں وہیں وہ ایک کمیونسٹ قائد اور مزدور تحریک کے معمار بھی ہیں۔ان کی شاعری پر کمیونسٹ اور مزدور تحریک کے جابجا اثرات تو ملتے ہیں لیکن ان کی رومانی شاعری بھی ایک عام انسان کے جذبات واحساسات کی حقیقی ترجمان نظر آتی ہے۔مخدوم ایک نیک دل انسان بھی تھے شاید اسی وجہ سے ان کا ہر عمل خلوص اور نیک نیتی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔خواہ ٹریڈ یونین تحریک سے وابستگی ہو یا مخدوم کی سیاسی فکر یا پھر اردو زبان وادب کی اپنے شعری تخلیقات کے ذریعہ خدمت۔ہر میدان میں مخدوم نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔مخدوم نے جس سیاسی شعور اور سماجی مقصد کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا وہ سب کچھ ان کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔ان کی شعری پختگی نے انقلابی شاعری کو ایک نئی جہت سے روشناس کروایا تھا۔مخدوم نے اپنی شاعری کے ذریعہ جہاں ہندوستانی قوم کی محرومیوں پر اپنے گہرے افسوس کا اظہار کیا ہے وہیں سیاسی وسماجی شعور کی بیداری کے لیے بھی ان کی قلمی کاوشیں جہان نو سے عبارت ہیں۔شائد اسی لیے انھوں نے کہا تھا

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح وشام ہو

ایسی ہی ایک نئی صبح کے متلاشی انقلابی شاعر مخدوم محی الدین نے زندگی کے ہر میدان میں جہد مسلسل کو اختیار کرنے کی تلقین کی تھی۔انھوں نے انقلاب کو ایک تحریک بلکہ منظّم تحریک بناتے ہوئے بالخصوص ٹریڈ یونینوں کو ایوان حکومت تک اپنے حقیقی وجائز مسائل کی یکسوئی کے لیے ایک استحکام عطا کیا تھا۔مخدوم کی زندگی ان کی جدوجہد اور ان کی شاعری کا مقصد ایک سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا تھا ان کی شخصیت جتنے حسین خانوں میں منقسم تھی وہ زندگی کو بھی اتنی ہی دلکش اور رنگین بنانے کے آرزومند تھے۔بہر حال ایسے انقلابی شاعر اور مزدوروں کے قائد ورہنما کی صد سالہ تقاریب کے سلسلہ میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان' ادب وثقافت کی جانب سے دو روزہ تقاریب کے انعقاد اور اس موقع پر شائع کی جانے والی کتاب ''مخدوم شاعر نبض شناس'' کی اشاعت کے لیے میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر' پرووائس چانسلر' رجسٹرار اور تمام اراکین کو مبارک باد دیتا ہوں۔یہ تقریب ایک ایسے خوشگوار موقع پر منعقد کی گئی ہے جب کہ یونیورسٹی خود بھی اپنی تاسیس کا دس سالہ جشن منارہی ہے۔وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان کی کامیاب قیادت نے آج اردو کی اس پہلی مرکزی یونیورسٹی کو ترقی کی جو سمت اور رفتار عطا کی ہے وہ نہ صرف قابل ستائش ہے بلکہ دوسری یونیورسٹیوں کے لیے قابل تقلید بھی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر مغنی تبسم
سابق صدر شعبۂ اُردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

مخدوم محی الدین کی معنویت اور عصرِ حاضر

مخدوم محی الدین ہمارے عہد کے شاعر تھے۔ ان کی شاعری عصر حاضر کی عکاس اور نقاد تھی۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی وفات کے بعد ملکی اور بین الاقوامی حالات میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ تبدیلیاں تو خود ان کی زندگی کے دوران میں وقوع پذیر ہوتی رہیں۔ جب انھوں نے شعر کہنا شروع کیا ہندوستان غلام تھا۔ عوام افلاس، جہالت اور توہمات کے اسیر تھے۔ تہذیبی اقدار پامال ہوچکی تھیں۔ اپنی نظم ''حویلی'' میں مخدوم نے اس دور کے ہندوستان کی تصویر کھینچی ہے:

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا، جس طرف دیکھو کھنڈر
رہزنوں کا قصرِ شوریٰ، قاتلوں کی خواب گاہ
کھل کھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ

جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا، ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا

یہ تصویر آج تک نہیں بدلی مخدوم محی الدین کی نظم ''ایشیا''، ہندوستان، پاکستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں میں آج بھی صادق آتی ہے۔ جہاں غربت اور افلاس کا دور دورہ ہے، کسان فاقہ کشی کا شکار ہیں، اکثریت تعلیم سے محروم ہے، توہم پرستی عام ہے۔ اپنی اس نظم میں مخدوم نے مشرق کو ایک بے گور وکفن ٹھٹھری ہوئی ننگی نعش سے تشبیہ دی تھی جو مغربی چیلوں کا لقمہ بنی ہوئی ہے۔ ایشیا کے نوآبادیاتی ملکوں کی آزادی کے بعد بھی حالات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ہندوستان میں انگریز سامراج کی جگہ سرمایہ داروں نے لے لی ہے اور سرمایہ داروں نے اپنی حکومتیں قائم کرلی ہیں۔ لیکن اب وہ امریکی سامراج کے غلام بنے ہوئے ہیں۔ دہشت گردی کے استحصال کے نام پر امریکہ نے افغانستان اور عراق میں اپنے قدم جمالیے ہیں اور اب وہ مشرق وسطیٰ اور خلیجی ملکوں پر اپنی گرفت مضبوط کررہا ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ کے قتل پر مخدوم کی نظم کے یہ مصرعے امریکی سامراج کی سازش کو طشت از بام کرتے ہیں:

وہ ہاتھ آج بھی موجود و کارفرما ہے
وہ ہاتھ جس نے پلایا کسی کو زہر کا جام
وہ ہاتھ جس نے چڑھایا کسی کو سولی پر
وہ ہاتھ وادی سینا میں ویت نام میں ہے

اور ویت نام کے پس منظر میں لکھی گئی نظم ''دُرّۂ موت'' بوسینا، افغانستان اور عراق کی بھی یاد دلاتی ہے:

اس تباہی کی گزرگاہ سے چل
یہ کوئی رستہ ہے جس رستے میں
نہ کوئی پھول نہ پتا
نہ کوئی پیڑ نہ پھل
اک ہیولائے سیہ
حدنظر
جس طرف دیکھو کھنڈر
دشت خاموشی سے جب گزرو گے
کئی امیدوں کی لاشوں سے گزرنا ہوگا

مخدوم کی نظمیں ''جنگ''، ''زلف چلیپا'' اور ''انقلاب'' آج بھی اپنی معنویت رکھتی ہیں اور دلوں پر اثر کرتی ہیں۔ یہ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

نکلے وہاں توپ سے بربادیوں کے راگ
باغ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
اب دلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ
خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہ موت پہ رقصاں ہے زندگی
(جنگ)

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام
کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرق گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج
زرگری کا رقص ہے سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچے میں مرگ ناگہاں کا رقص ہے
اب کسی سینے میں روح شادماں گاتی نہیں
زندگی کی اب کہیں ہلچل نظر آتی نہیں
(زلف چلیپا)

مخدوم نے جس انقلاب کا خواب دیکھا تھا اور جس کا زندگی بھر انتظار کیا تھا۔ وہ کہیں ٹھہر گیا ہے اور آج انسانیت اس کی منتظر ہے۔ مخدوم کے الفاظ میں:

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
توہمات کا آدم غلام ہے اب تک
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

مخدوم کی چند نظموں کا موضوع جنگ ہے۔ اس سلسلے کی پہلی نظم کا عنوان ہی ''جنگ'' ہے۔ اس نظم میں جنگ کی تباہ کاریوں کی پراثر تصویر کھینچی گئی ہے۔ اسے پڑھ کر جنگ سے نفرت ہو جاتی ہے:

نکلے وہاں توپ سے بربادیوں کے راگ

باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
امن و اماں کی نبض چھٹی جاری ہے کیوں
بالین زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں
اب دلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاک
اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ

انفرادی انسانی سطح پر جنگ کا المناک اور اندوہ گیں رخ مخدوم نے اپنی نظم ''سپاہی'' میں پیش کیا ہے:

کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوک بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بو آرہی ہے
زندگی ہے کہ چلّا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جارہا ہے

آگے چل کر دوسری جنگ عظیم کو مخدوم نے سیاسی سطح پر جنگ آزادی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک طرف دوسری عالمی جنگ میں فاشزم کے خلاف جمہوری اور سوشلسٹ قوتیں صف آرا تھیں اور ادھر ہندوستان میں آزادی کی جنگ لڑی جارہی تھی۔ برطانوی سامراج فاشزم کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس لیے جنگ میں اس کا ساتھ دینا ایک سیاسی مصلحت تھی اور اس کا مقصد سوشلزم کی حمایت کرنا تھا۔ اس پس منظر میں مخدوم کی نظم جنگ آزادی اپنا جواز رکھتی ہے:

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی

آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی

آج عالمی صورت حال بہت کچھ بدل چکی ہے۔ سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد طاقت کا توازن برقرار نہیں رہا۔ اب امریکی اور برطانوی سامراج میں گٹھ جوڑ ہوگئی ہے۔ امریکہ ساری دنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ کسی نہ کسی بہانے کمزور ملکوں پر اقتدار جمانے کی فکر میں ہے۔ افغانستان اور عراق پر عملاً قابض ہو چکا ہے۔ اس کی نظریں خاص طور پر ان ملکوں پر ہیں جہاں تیل کے ذخائر ہیں۔ اس کے علاوہ عالمیانے کے نام پر صارفیت کو بڑھاوا دے رہا ہے اور تیسری دنیا کے نوآزاد اور سابق نوآبادیاتی ملکوں کو معاشی طور پر اپنا غلام بنا رہا ہے۔ اب جنگیں یکطرفہ ہوگئی ہیں۔ جنگ سے مراد امریکہ کی جارحانہ کارروائی ہے۔ اس سب کے باوجود جنگ بہرحال جنگ ہے۔ اور جنگ کی تباہ کاریوں کی دلوں کو ہلا دینے والی جو تصویر مخدوم نے کھینچی ہے وہ آج بھی بدلی نہیں ہے۔ ہندوستان کی آزادی سے قبل آزادی کی جدوجہد کے دوران مستقبل کے جو خواب دیکھے گئے تھے اس کی جھلک مخدوم کی نظم ''مستقبل'' میں نظر آتی ہے:

نہ سلطانی تیرگی ہے نہ زاری
نہ تخت سلیماں نہ سرمایہ داری
غریبوں کی چیخیں نہ شاہی سواری

چلا آرہا ہے ، چلا آرہا ہے

مستقبل کا یہ خواب آج تک بے تعبیر ہے۔آزادی کے بعد ہندوستان میں سرمایہ داروں اور پاکستان میں جاگیرداروں کے مفادات کی نگہباں سیاسی جماعتیں برسراقتدار آگئیں۔فیض احمد فیض نے اپنی مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

مخدوم نے اپنی نظم ''چاند تاروں کا بن'' میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے حالات کا تقابل کیا ہے۔آزادی سے پہلے:

تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن

لیکن آزادی کے بعد:

رات کے جگمگاتے دہکتے بدن
صبح دم ایک دیوار غم بن گئے
خارزار الم بن گئے

اس صورت حال سے وہ مایوس نہیں ہیں کیوں کہ:

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اجالا ، اجالا بھی ہے

اور وہ عوام کو یہ پیغام دیتے ہیں:

ہمدمو
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی

لیکن ہندوستان میں جمہوریت اور سوشلزم کی طاقتیں کمزور پڑتی گئیں۔جس کی وجہ سے مخدوم اداس اور محزوں ہو جاتے اس کیفیت کا اظہار ان کی نظموں ''سناٹا'' اور ''وادی فردا'' میں اس طرح ہوا ہے۔

''ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتا کھڑکے
کوئی پگھلا ہوا موتی
کوئی آنسو
کوئی دل
کچھ بھی نہیں
کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر،،

(سناٹا)

''رات ہی رات ہے سناٹا ہی سناٹا ہے
کوئی ساحل بھی نہیں
کوئی کنارہ بھی نہیں
کوئی جگنو بھی نہیں
کوئی ستارہ بھی نہیں

میری اس وادی فردا کے اوخوش پر طائر
یہ اندھیرا ہی تری راہ گزر
اس فضا میں کوئی دروازہ نہ دہلیز نہ در
تری پرواز ہی بن جاتی ہے سامان سفر

(وادی فردا)

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں جو بھیانک فرقہ وارانہ فسادات ہوئے مخدوم کی شاعری ان کے ذکر سے خالی ہے۔شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ ایک عارضی Phase ہے۔ ہندوستان کی سیکولر سرمایہ دارانہ حکومت نے اس پر قابو پالیا لیکن بعد میں اندرا گاندھی نے فرقہ وارانہ سیاست کو ہوا دی جس کی وجہ سے کانگریس کا سیکولر کردار مسخ ہوگیا۔ بی جے پی برسر اقتدار آئی تو ہندوتوا نے زور پکڑا۔ ہندوستان کا سیکولر کردار بھی مسخ ہوگیا۔ گجرات کے شرمناک فسادات اور اقلیتوں پر جارحانہ مظالم نے ساری دنیا میں ہندوستان کا سر جھکا دیا۔ مخدوم آج حیات ہوتے تو ان کا ردعمل یقیناً شدید ہوتا۔

مخدوم محی الدین ایک روایت شکن انقلابی فن کار تھے۔ جس نے عصری اسالیب کو اپنا کر ان میں نئی اختراعیں کیں۔ اظہار کے نئے پیرایوں سے اُردو شاعری کو روشناس کیا۔

مخدوم نے شعر گوئی کا آغاز پابند نظم نگاری سے کیا اور نظم کے لیے قصیدہ، مثنوی، مخمس، ترکیب بند اور ترجیع بند کے قدیم سانچے استعمال کیے اور گیت کے سانچے سے بھی استفادہ کیا۔ نئے انداز کے اردو گیت لکھے۔

حلقہ ارباب ذوق کے شعرا' ن۔م۔راشد اور میراجی نے نظم آزاد کو رواج دیا تھا۔ ترقی پسند شعرا نے ابتداء میں اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ مخدوم نے اس ہیئت میں اپنی معرکتہ

الآرا نظم ''اندھیرا'' تخلیق کی جس میں علامت نگاری اور براہ راست اظہار حقیقیت کو بڑی خوبی کے ساتھ ہم آمیز کیا گیا ہے۔ سرخ سویرا میں شامل دوسری آزاد نظم ''استالین'' ہے۔ یہ نظم شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے۔ جمبول جابر نے جب یہ نظم لکھی استالین روسی عوام ہی کا نہیں بلکہ عالمی سوشلسٹ سماج کا ہیرو اور رہنما تھا۔ مخدوم نے بڑے خلوص اور عقیدت کے ساتھ اس نظم کا ترجمہ کیا ہے۔ دوسری جنگ کے پس منظر میں یہ نظم ایک پر اثر رجز کا انداز رکھتی ہے۔ نظم کی کئی سطریں نہایت اثر انگیز ہیں۔

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کردوں
برق پا وہ مرا راہوار کہاں ہے لانا
تشنہ خوں وہ مری تلوار کہاں ہے لانا
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں استالین

مخدوم محی الدین نے اپنی آزاد نظموں میں اظہار کے جو تجربے کیے ہیں ان کی وجہ سے ہر نظم اپنی جداگانہ شان رکھتی ہے۔ قید، چارہ گر، چاند تاروں کا بن، فاصلے، احساس کی رات، چپ نہ رہو، ہم دونوں، وادی فردا، وقت بے درد مسیحا، درہ موت، رات کے بارہ بجے اور ''رت'' ان میں سے ہر نظم کا اپنا منفرد انداز ہے۔ مخدوم محی الدین نے اردو کی غزلیہ شاعری کو بھی نیا رخ دیا۔ مخدوم کی غزل روایتی غزل کی رسمیات سے مبرا ہے اور جدید غزلیہ شاعری سے بھی اس کے تیور مختلف ہیں۔ اکثر غزلیں مسلسل ہیں۔ ان میں جذبہ اور خیال یک جا ہوگئے ہیں۔ غم جاناں اور غم دوراں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ خالص عشقیہ اشعار کے ساتھ ان

غزلوں میں ایسے فکر انگیز اور تہہ دار اشعار بھی ملتے ہیں جیسے:

سیماب و شی ، تشنہ لبی ، باخبری ہے
اس دشت میں گر رخت سفر ہے تو یہی ہے

سناتی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا
اب اور کیا کہیں کس کس کو سوگوار کریں

دلوں کی تشنگی جتنی ، دلوں کا غم جتنا
اسی قدر ہے زمانے میں حسن یار کی بات

دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چتا جلتی ہے
اب کی دیوالی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے

سب وسوسے ہیں گرد رہ کارواں کے ساتھ
آگے ہے مشعلوں کا دھواں دیکھتے چلیں

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقش کف پا آخر شب

مخدوم محی الدین کی نظموں اور غزلوں کے اس جائزے سے اندازہ ہوگا کہ ان کی شاعری نہ صرف عصرِ حاضر کی ترجمان ہے بلکہ مستقبل کی نقیب بھی ہے اور اس کی گونج آنے والے زمانوں میں بھی سنائی دیتی رہے گی۔

☆☆☆

جناب مجتبیٰ حسین
نامور مزاح نگار

مخدوم محی الدین

(سوانحی خاکہ)

مخدوم محی الدین ''انڈر گراؤنڈ'' تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔ ان دنوں بھی مجھے اتنی ہی انگریزی اور اردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے۔ لہٰذا میں اپنے تئیں ''انڈر گراؤنڈ'' کا آسان ترجمہ ''زیرِ زمین'' کر کے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیرِ زمین رہ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو وہ ''یکے از معدنیات'' قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔ بھلا ایک آدمی کو خواہ مخواہ ''زیرِ زمین'' جا کر رہنے کی کیا ضروری ہے۔ ترجمے کی یہ غلطی مجھ سے بچپن میں سرزد ہوئی تھی مگر جب بڑے ہوئے تو کہیں پڑھا کہ پاکستان کے ایک شاعر سے ترجمے کی یہ غلطی تو عین جوانی میں سرزد ہوئی تھی۔ جن دنوں بنّے بھائی یعنی سجّاد ظہیر پاکستان میں پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں روپوش تھے، تاجکستان کے مشہور شاعر مرزا ترسون زادہ پاکستان کے دورے پر آئے اور ایک پاکستانی شاعر سے فارسی میں پوچھا ''سجاد ظہیر کجا است؟''۔

پاکستانی شاعر نے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا ''سجاد ظہیر

زیرِ زمین است۔'' یہ سنتے ہی مرزا ترسون زادہ کی آنکھوں میں کم وبیش اتنی ہی روانی کے ساتھ آنسو آ گئے۔ بولے ''یہ کب ہوا؟ ہمیں تو کچھ پتہ نہ چلا، آخر انھیں کیا بیماری ہوگئی تھی؟''

پاکستانی شاعر کو اچانک اپنی فارسی دانی کا احساس ہوا تو ہاتھوں اور بھنوؤں کے اشارے سے ماقبی فارسی بولتے ہوئے مرزا ترسون زادہ پر ''زیرِ زمین'' اور ''روپوش'' ہونے کے نازک فرق کو واضح کیا۔ اسی طرح مخدوم بھی میرے لیے ایک عرصے تک ''زیرِ زمین'' ہی رہے اور کسی نے میری غلط فہمی دور نہیں کی۔

پھر جب ہم نے شعور سنبھالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ مخدوم بڑی تیزی سے ہمارے شعور کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ پھر حصہ بنتے بنتے وہ مکمل شعور ہی بن گئے۔ مخدوم سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے ایک دوست مخدوم کے مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' کو رحل پر رکھ کر نہ صرف پڑھا کرتے تھے بلکہ مطالعے کے دوران میں آگے اور پیچھے جھولتے بھی تھے۔ ہے کوئی شاعر جس کا کلام اس طرح پڑھا گیا ہو؟

صاحبو، وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر صبح بستر سے جاگتے ہی آسمان پر نظر جاتی تھی کہ کہیں ''سرخ سویرا'' تو نہیں آ گیا۔ جی چاہتا اپنے ملک میں بھی ایک عدد ''انقلابِ روس'' لے آئیں۔ انقلاب کے انتظار میں سگریٹیں پی پی کر کئی راتیں گزاریں۔ ہمارا سوشلزم وہی تھا جو مخدوم اور فیض کی شاعری، کرشن چندر کے افسانوں، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی تحریروں کے وسیلے سے ہم تک پہنچا تھا۔ یہ خالصتاً اردو سوشلزم تھا۔ مگر ہم حیدرآبادیوں کے لیے مخدوم صرف شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔ مخدوم کے زیرِ زمین رہنے کی عادت کی وجہ سے ان کی شخصیت کے اطراف ایک عجیب سا سحر پیدا ہو گیا تھا۔ یار لوگوں نے ان کے بارے میں باتیں بھی کچھ ایسی پھیلا رکھی تھیں کہ کبھی کبھی مخدوم ایک مافوق الفطرت شئے دکھائی دیتے

تھے۔ کہا جاتا تھا کہ مخدوم بیک وقت چار مختلف مقامات پر موجود رہتے ہیں۔ اگر چار بجے ورنگل میں مزدوروں کے ایک خفیہ جلسے سے خطاب کر رہے ہیں تو ٹھیک اسی وقت نلگنڈہ میں ایک زمین دار کی زمین کسانوں میں بانٹ رہے ہیں اور پھر ٹھیک اسی سمئے حیدرآباد کے ایک محلے میں اپنے ایک دوست کو اپنی تازہ نظم سنا رہے ہیں اور پھر اسی وقت - اب خیر جانے بھی دیجیے، ایسی باتیں کہاں تک سنائی جائیں۔ مخدوم کے بارے میں اس قسم کے انکشافات کو سن کر ہمارے کمسن اور نوخیز خون کی جو حالت ہوتی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں۔ خون رگوں میں ابلا پڑتا تھا جسے بعد میں مخدوم کے کلام کے ذریعے ہی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ علاج بالمثل اسی کو کہتے ہیں۔ اس وقت تک مخدوم کو نہیں دیکھا تھا، حالاں کہ ان کے ہر جگہ Omni Present ہونے کی اتنی ساری افواہیں سن رکھی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ مخدوم جب قید سے رہا ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ وہ شاہ آباد میں مزدوروں کے ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ ان دنوں میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ جس شاعر کا کلام اپنے لیے وظیفہ تھا اور جس کی تصویر صدا دل کے آئینے میں رکھی رہتی تھی اس کے شاہ آباد آنے کی اطلاع ملی تو رگوں میں خون کچھ اس زور سے ابلا کہ میں اور میرا وہ دوست جو ''سرخ سویرا'' کو رحل پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا اسٹیشن کی طرف بھاگے۔ معلوم ہوا کہ شاہ آباد جانے والا مدراس میل ابھی جا چکا ہے۔ انکوائری سے پوچھا کہ شاہ آباد کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے؟ جواب ملا۔ ''25 کلومیٹر''۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ آج عشق آتشِ نمرود میں کود پڑے گا اور 25 کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرے گا۔ اپنے جنون کی کہاں تک تشہیر کی جائے، یہ ہماری زندگی کی پہلی اور آخری ''لانگ مارچ'' تھی۔ مگر شاہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخدوم آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے

ماتھے پیٹ کر چپ ہو رہے۔ مگر مخدوم مافوق الفطرت شئے تو تھے ہی۔ انھیں غالباً کسی غیبی طاقت نے بتایا تھا کہ گلبرگہ میں دو روحیں ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔ لہٰذا پندرہ دن بعد مخدوم گلبرگہ چلے آئے مزدوروں کے کسی جلسے کو مخاطب کرنے۔ جلسے کے بعد کالج کے نوجوانوں نے انھیں گھیر لیا۔ مجھے یاد ہے وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ایسا روشن چاند ہم نے زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گلبرکہ کے مومن پورہ میں ایک بزرگ کے مزار کے سامنے ایک چبوترے پر مخدوم ہم نوجوانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور مخدوم ہم سب کو اپنا کلام سنا رہے تھے۔ ''سرخ سویرا'' تو ہمیں زبانی یاد تھا، لہٰذا ہم نے کہا ''مخدوم بھائی اپنا کوئی غیر مطبوعہ کلام سنایئے۔'' ہنس کو بولے ''میں غیر مطبوعہ کلام نہیں کہتا، ہمیشہ مطبوعہ کہتا ہوں۔''

پھر میں حیدرآباد آیا۔ مخدوم سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر یوں کہ کئی برس بعد ایک دن میں پروفیسر حسن عسکری اور مخدوم حیدرآباد کے ویکاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجھے مخدوم سے ملنے کا وہ پہلا اور اچھوتا اشتیاق یاد آیا۔ میں نے مخدوم سے کہا ''مخدوم بھائی آپ کو پتہ نہیں کہ کئی برس پہلے آپ سے ملنے کے لیے میں اور میرے ایک ساتھی نے گلبرگہ سے شاہ آباد تک پیدل سفر کیا تھا۔'' یہ سنتے ہی نہایت رازداری کے انداز میں بولے ''اچھا تو اب ملو۔ بتاؤ کیا کام تھا تمھیں مجھ سے۔ کوئی خاص بات تھی کیا؟''

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا ''مخدوم بھائی اب تو مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں اس وقت آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی باتیں، بہت سی خواہشیں اور بہت سے کام یوں ہی اوجھل ہو جاتے ہیں۔''

بولے ''یاد کر کے بتانا۔ تمھارا حافظہ کمزور ہوتا جا رہا ہے اور ہاں آئندہ کبھی پیدل چلنے

کی غلطی نہ کرنا۔'' یہ کہہ کر مخدوم نے زوردار قہقہہ لگایا (مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ مخدوم نے یہ قہقہہ مجھے پر لگایا تھا یا اپنے آپ پر بعض قہقہوں کے سرچشمے کا سراغ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے)۔ اپنی بات کو ختم کر کے مخدوم نے مجھ سے اور حسن عسکری سے زوردار مصافحے کیے۔ ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہتے، جو وہ اکثر کہتے تھے اور مذاق کی کوئی بات کرتے، جو وہ اکثر کرتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضروری کر لیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی مخدوم روبرو ہوتے تو میں بائیں ہاتھ سے سگریٹ پیتا تھا اور دائیں ہاتھ کو مصافحے کے لیے محفوظ رکھتا تھا۔ ایک بار مجھے اور مخدوم کو ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لیے بمبئی جانا پڑ گیا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر میں پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا اور دوسرے میں ہولڈال۔ مخدوم نے مجھے دیکھتے ہی مصافحہ والا فقرہ کہہ دیا اور میں نے اٹیچی کیس کو نیچے رکھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ پھر انھوں نے تابڑ توڑ کئی بار مصافحہ فقرے کہہ کر مجھ سے اٹیچی کیس کو نیچے رکھوایا۔ میں ان کے فقروں سے ایسا الرجک ہوا کہ ابھی وہ آدھا فقرہ ہی کہتے تھے کہ میں اٹیچی کو نیچے رکھ دیتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بولے ''بیٹا' اب تم میرے ان فقروں پر بھی اٹیچی کیس نیچے رکھنے لگے ہو جن پر میں مصافحہ نہیں کرتا۔ تم خود ورزش کرنا چاہتے ہو تو کرو۔''

یہ کہہ کر مجھے اٹیچی کیس نیچے رکھنے کا حکم دیا۔ مصافحہ کیا اور بولے ''خبردار جواب کبھی اٹیچی کیس نیچے رکھا'' اور اس کے بعد پھر مصافحے کی منزل آ گئی۔

مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔ اپنا مذاق آپ اڑانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک بار علی الصبح اورینٹ ہوٹل میں پہنچ کر بیرے سے پوچھا ''نہاری ہے؟

بیرا بولا ''نہیں ہے۔''

مخدوم نے پوچھا ''آملیٹ ہے؟''

بیرا بولا ''نہیں ہے۔''

مخدوم نے پوچھا ''کھانے کے لیے کچھ ہے؟''

بیرا بولا ''اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس پر مخدوم بولے ''یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ یہاں کچھ نہیں ہے۔''

ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تو اسے سنانے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ اپنی اس عادت سے متعلق خود ہی ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے۔ ایک دن ان سے غزل ہوگئی تو فوراً اورینٹ ہوٹل چلے آئے کہ کوئی مائی کا لال مل جائے تو اسے غزل سنائیں۔ یہاں کوئی نہ ملا تو ''صبا'' کے دفتر چلے گئے۔ وہاں بھی کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کر چائینز بار میں چلے گئے۔ بار کے بیرے قاسم کو بلا کر کہا ''دو پیگ وہسکی لے آؤ۔'' قاسم وہسکی لے آیا تو اس سے بولے ''بیٹھو اور وہسکی پیو۔'' قاسم شرماتا رہا مگر وہ مُصر رہے۔ اس نے کھڑے کھڑے وہسکی پی لی۔ پھر بولے ''دو پیگ وہسکی اور لے آؤ۔'' دوسرے دور میں بھی انھوں نے قاسم کو وہسکی پلائی۔ پھر تیسرا دور چلا۔ اس کے بعد مخدوم نے قاسم سے کہا:

''اچھا قاسم، اب میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمھیں اپنی تازہ غزل کے کچھ شعر سنانا چاہتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی قاسم نے کہا ''صاحب؟ آپ بہت پی چکے ہیں۔ آپ کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ چلیے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔''

مخدوم کہا کرتے تھے کہ اپنی ہوش مندی کے ہزار ثبوت پیش کرنے کے باوجود قاسم نے اس رات ان کی غزل نہیں سنی۔ یہ لطیفہ سنا کر خود ہی ہنستے تھے اور مخاطب سے زوردار

مصافحہ کرتے تھے۔

یہ لطیفہ بھی مخدوم ہی سنایا کرتے تھے جو ان کے دورِ روپوشی سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار یہ اپنے ایک برہمن دوست کے گھر روپوش ہو گئے۔ ان کا برہمن دوست بھی پارٹی کا ممبر تھا۔ ان کے دوست نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ ''مخدوم بھائی میرے والد بڑے قدامت پرست ہیں، اسی لیے ان پر کبھی یہ ظاہر نہ کرنا کہ آپ برہمن نہیں ہیں۔ اپنی برہمنیت کی لاج رکھنا۔''

ایک دن ان کے دوست کے والد نے مخدوم سے کہا ''بھئی تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں ہو؟ تمھارے دھرم کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کہیں تم گوشت تو نہیں کھاتے۔''

مخدوم نے جھٹ سے کہا ''لاحول ولاقوۃ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں گوشت کھاتا ہوں۔ نعوذ باللہ یہ تو مجھ پر سراسر تہمت ہے۔''

اس نان ویجیٹیرین جملے کے بعد ان کی روپوشی کا کیا بنا اس کے بارے میں مخدوم کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ جہاں خوش مذاقی اور شگفتہ مزاجی کا پیکر تھے وہیں عقیدے کے معاملے میں بے حد سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ وہ ہنستے کھیلتے سیٹی بجاتے خوش خوش اورینٹ ہوٹل آتے مگر ٹیبل پر بحث کے بعد جب جانے لگتے تو مٹھیاں بھنچی ہوتی تھیں، منہ سے کف نکل رہا ہوتا تھا اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے مخدوم بہت احتیاط سے برتنے کی چیز تھے۔ ذرا کوئی چوک گیا اور مخدوم کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

وہ چھوٹوں کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آتے تھے۔ حیدرآباد کے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت انھوں نے کی۔ سلیمان اریب، عزیز قیسی، اقبال متین، وحید اختر، جیلانی بانو، انور معظم، آمنہ ابوالحسن، شاذ تمکنت، عاتق شاہ، عوض سعید اور مغنی تبسم یہ سب

مخدوم سے متاثر تھے۔ وہ میری بھی ہر قدم پر ہمت افزائی کرتے تھے چناں چہ مجھے ''مسخرا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ اب اس سے زیادہ کوئی میری ہمت افزائی کر کے دکھا دے۔ اردو کے مسخروں یعنی مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی تو اس کا افتتاح انھوں نے ہی فرمایا۔ میرے مضامین کے پہلے مجموعے کی رسمِ اجرا بھی انھوں نے ہی از راہِ تمسخر انجام دی تھی۔

ادیبوں سے وہ الجھتے بھی تھے۔ اس معاملے میں وحید اختر پر ان کی بڑی نظرِ عنایت رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی دوستوں کو جان بوجھ کر چھیڑتے بھی تھے۔ ایک رات سلیمان اریب کے گھر پر حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد سے کہا ''شاعری، مصوری سے کہیں زیادہ طاقتور میڈیم ہے۔''

سعید بن محمد نے برش بکف جواب دیا ''مصوری اور شاعری کا کیا تقابل۔ شاعری میں تم جو چیز بیان نہیں کر سکتے ہم رنگوں اور فارم میں بیان کر دیتے ہیں۔ تم کہو تو میں ساری اردو شاعری کو پینٹ کر کے رکھ دوں۔'' مخدوم بولے ''ساری اردو شاعری تو بہت بڑی بات ہے، تم اس معمولی مصرعے کو ہی پینٹ کر کے دکھا دو:

''پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے''

سعید بن محمد بولے ''یہ کون سی مشکل بات ہے، میں کینوس پر گلاب کی ایک پنکھڑی بنا دوں گا۔''

بولے ''پنکھڑی گلاب کی تو پینٹ ہو گئی مگر ''سی'' کو کیسے پینٹ کرو گے؟''

سعید بن محمد بولے ''سی'' بھی بھلا کوئی پینٹ کرنے کی چیز ہے؟''

مخدوم بولے ''مصرعے کی جان تو ''سی'' ہی ہے۔ سعید آج میں تمھیں جانے نہیں دوں گا جب تک تم ''سی'' کو پینٹ نہیں کرو گے۔''

یہ سنتے ہی سعید بن محمد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مجھے اس وقت مخدوم کا وہ مضمون یاد آ رہا ہے جو انھوں نے حیدرآباد کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بہ زبان انگریزی ''السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا'' میں لکھا تھا۔ مضمون کی اشاعت کا چوں کہ پہلے سے اعلان ہو چکا تھا اس لیے جس دن ویکلی کا شمارہ حیدرآباد پہنچا، اردو ادیبوں اور شاعروں نے دھڑا دھڑ اس کی کاپیاں خرید لیں۔ نیوز پیپر اسٹال والا سخت حیران کہ اردو شاعروں کو آج کیا ہو گیا ہے کہ انگریزی کا رسالہ خریدے چلے جا رہے ہیں۔ میں عابد روڈ سے گزر رہا تھا کہ حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر ویکلی کا شمارہ ہاتھ میں پکڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے ''بھئی، اس میں مخدوم کا مضمون کہاں ہے بتاؤ؟''

میں نے مخدوم کا مضمون نکال کر دکھایا تو بولے ''اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس میں میرا نام کہاں ہے؟''

پہلے تو میں بڑی دیر تک اپنا نام مضمون میں تلاش کرتا رہا۔ یہ نہ ملا تو شاعرِ موصوف کا نام تلاش کرنے لگا۔ حسبِ توقع یہ بھی وہاں موجود نہ تھا۔ مگر اسی بیچ مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سلیمان اریب کے نام کے نیچے ایک لکیر کھینچتے ہوئے شاعرِ موصوف سے کہا- لیجیے قبلہ، یہ رہا آپ کا نام۔''

شاعرِ موصوف ویکلی کے شمارے کو سینے سے لگائے خوش خوش چلے گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد مخدوم انھیں مل گئے تو انھوں نے بڑی احسان مندی کے ساتھ مضمون میں ان کا نام شامل رکھنے کا شکریہ ادا کیا۔

مخدوم نے کہا ''قبلہ، آپ کو کس نے بتایا کہ آپ کا نام مضمون میں شامل ہے؟''

وہ بولے ''ابھی ابھی مجتبیٰ نے مجھے بتایا ہے۔''

مخدوم بولے ''مولانا، مجتبیٰ کو بھی اتنی ہی انگریزی آتی ہے جتنی کہ آپ کو آتی ہے۔ جایئے جایئے، آپ کا نام میں نے نہیں لکھا ہے۔''

اس مضمون کے بعد حیدرآباد کے کئی نوجوانوں اور ادیبوں کو مخدوم سے شکایت ہوگئی۔ ایک دن اورینٹ ہوٹل میں یہی مضمون زیرِ بحث تھا۔ مخدوم بولے ''بھئی ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیے۔ اس کا نام یا کلام چھپے یا نہ چھپے اسے تو بے تعلق رہنا چاہیے۔''

اس کے بعد بحث ختم ہوگئی اور دوسرے مسائل زیرِ بحث آ گئے۔ مگر اسی بیچ مجھے پھر ایک شرارت سوجھی، میں نے بالکل ہی بے نیاز ہوکر کہا ''مخدوم بھائی، آپ کی ایک نظم دلی کے ایک رسالے کے تازہ شمارے میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔'' پوچھا ''کون سے رسالے میں؟''

میں نے کہا ''مجھے نام تو یاد نہیں رہا مگر عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی میں یہ رسالہ دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

مخدوم تھوڑی دیر تو انجان اور بے تعلق بنے رہے۔ پھر اچانک کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ ان کی عادت تھی۔ پھر بولے ''اچھا اب چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔ میرے ساتھ کچھ احباب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا ''مخدوم بھائی یہاں سے سیدھے بک اسٹال پر جائیں گے، چلو ہم بھی چلیں۔''

ہم لوگ بک اسٹال پر پہنچے تو مخدوم سچ مچ وہاں موجود تھے اور رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جوں ہی ہم پر ان کی نظر پڑی، انھوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے

''کیوں بے مسخرے، ہم سے بدمعاشی کرتا ہے۔''

میں نے کہا ''مخدوم بھائی، میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے نام اور کلام سے کس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے۔''

مخدوم کو حیدرآباد سے بے پناہ پیار تھا۔ جسے وہ ہمیشہ ''وطنِ مالوف'' کہا کرتے تھے۔ حیدرآباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدرآباد کے اندر۔ حیدرآباد کی گلی گلی میں ان کے چرچے تھے۔ حیدرآبادیوں نے انھیں ٹوٹ کر چاہا بھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے تو اپنے گھر کا نام ہی ''چنبیلی کا منڈوا'' رکھ چھوڑا تھا جو مخدوم کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے۔ لوگ اپنے گھروں کے نام رکھتے ہیں، ڈاکٹر گوڑ نے اپنے گھر کا عنوان رکھا تھا۔ اگرچہ اپنے گھر میں معنویت پیدا کرنے کے لیے چنبیلی کی بیل بھی لگا رکھی تھی۔ مگر اب بھی ان کے گھروں میں ''چنبیلی کا منڈوا'' کم اور مخدوم کی نظم زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ سارا دن پارٹی کا کام کرتے اور شام کو تھوڑا سا وقت دوستوں میں گزارتے تھے۔ جہاں احساس ہوا کہ وقت ضائع ہو رہا ہے، چٹ سے اٹھ جاتے تھے اور محفل سے غائب۔ وہ دنیا سے گئے بھی اسی طرح یعنی ایک دن چٹ سے چلے گئے۔

آخری مرتبہ جب وہ دہلی جا رہے تھے تو مجھ سے روزنامہ ''سیاست'' کے دفتر پر ملے۔ میں نے پوچھا ''مخدوم بھائی واپسی کب ہوگی؟''

بولے ''یہ دو چار دن میں آ جاؤں گا۔''

وہ بات کے بڑے پکّے تھے۔ لہٰذا حیدرآباد واپس آئے مگر کچھ اس شان کے ساتھ کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے کندھوں پر سوار تھے۔ سیاسی کامرانیوں کے بعد مخدوم کا ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہونا یا مخدوم کے کندھے پر ڈاکٹر گوڑ کا سوار ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر اس بار وہ ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہوئے تو نیچے نہیں اترے۔ ہمیشہ کے لیے سب کے

دلوں میں ایک زخم بن کر اتر گئے۔ مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایسا جنازہ کسی شاعر اور وہ بھی اردو شاعر کو بھلا کہاں نصیب ہوگا۔ اور یوں وہ پھر ''زیرِ زمین'' چلے گئے۔ مگر اس بار ''زیرِ زمین'' جاتے ہوئے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے۔ اپنا سب کچھ دنیا کو سونپ گئے۔ اپنی شاعری، اپنا عقیدہ، اپنی باتیں، اپنے لطیفے، اپنی یادیں، غرض سب کچھ۔

مخدوم کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مخدوم ایک انسان نہیں تھے۔ جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی، ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔ اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں، کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔

☆☆☆

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی
سابق ڈین وصدر شعبہ اُردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

'فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے'۔۔۔ مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین ترقی پسندوں میں سیاسی طور پر سب سے زیادہ سرگرم ادبی شخصیت تھے۔ اُن کی شاعری کے عہد بہ عہد ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو رومانیت سے انقلاب تک ایک ایسا سفر ہے جس سے ترقی پسندوں کا پورا کارواں گزرا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اُس عہد کی نوجوان نسل کے باشعور اور حساس لوگ روایت پرفرسودگی اور توہم پرستی سے انحراف کر کے جب بغاوت کی طرف مائل ہوتے تھے تو یہی منزلیں ان کے لیے کشش رکھتی تھیں، اُن سب کے یہاں ادب کی کلاسیکی روایت سے انحراف کی ایک صورت یہ تھی کہ وہ غزل کو چھوڑ کر رفتہ رفتہ نظم کی طرف آتے تھے۔ مشقِ سخن کی ابتدا تو اساتذہ کے طرز غزل سے ہی ہوتی تھی۔ مگر وہ جلد محسوس کرنے لگتے تھے کہ اُن کے جذبہ واحساس پر اس کا شکنجہ سخت ہے۔ خصوصاً بیسویں صدی کے نوجوان کو عشق کے اظہار کے لیے وہ بندشیں راس نہیں آسکتی تھیں جو اس کی اصل خواہشات کو تشبیہوں، استعاروں یا طرز بیان پر پابندیوں کا اسیر کردے۔ وہ جذبات کا بے لاگ اور بے اختیارانہ اظہار کرنا چاہتے تھے جس کے لیے نظم سارے امکانات فراہم کرتی تھی۔ خصوصاً ان شاعروں کے ہاں عشق کا مرکز عورت ہوتی تھی اور غزل میں رواج

gender جنس کو افسانہ کرنے کا تھا۔ نظم میں نسوانی وجود اور اس سے وابستہ جسمانی حس کا بیان راست طور پر ہوسکتا تھا۔ چناں چہ مخدوم کے ہاں بھی اس دور کے دوسرے نوجوان شاعروں کی طرح رومانوی شاعری میں نہ صرف عورت کے وجود بلکہ اس کے اپنے جذبات سے ہمدردی کا اظہار ملتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ خوب صورت تشبیہات اور امیجری کے ذریعے اس Sensuorness کا بھی پتہ ہوتا ہے جو بالکل فطری ہے مگر جس کے اظہار پر سماجی پابندیاں ہیں۔ ان لوگوں کی شاعری میں عموماً عورت کے اپنے جذبات کے آزادانہ اظہار اور اپنے ذات پر اختیار نہ ہونے کی وجہ سے ہمدردی تھی جو پہلے پہل محبوبہ کے واسطے سے ان تک پہنچتی تھی۔ چناں چہ عورت کے وجود اس سے جذباتی لگاؤ کا اظہار روایتی سماج میں ایک باغیانہ رویہ تھا جو رومانی شاعری کے ذریعے عیاں ہوا۔ یہی باغیانہ مزاج انھیں اپنے گردوپیش کی صورت حال میں پھیلی ہوئی زندگی کو جھیلنے والے لوگوں کے ساتھ خود کو ہم کنار کرنے اور ان کے دکھوں میں شریک ہو کر اس کا مداوا ڈھونڈھنے پر آمادہ کرتا تھا۔ یہ رومانیت بڑی جانب دار اور متحرک تھی۔ اس کی بنا پر ہماری شاعری میں نئی جمالیاتی جہتیں عیاں ہوئیں۔ شاعری میں مناظر فطرت کی رنگ آمیزی اور اس سے انسانی زندگی اور سماج کو ہم رشتہ کر کے دیکھنا بھی ایک نئے قسم کا رویہ تھا۔ اس کی بدولت شاعری میں نئی امیجری اور نئے نئے استعارات اور تشبیہات تراشنے کا آزادانہ رجحان آیا۔

ان باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم مخدوم کی شاعری پر نظر ڈالیں تو ہمیں ان کے دور میں نمایاں ہونے والے ادبی اور سماجی شعور کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔ خوب صورت نظم جو آج بھی یاد کی جاتی ہے۔ **'انتظار'** ہے۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا

نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا

آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بُجھ رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی

شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

یہی وہ زمانہ ہے جب دوسری عالمی جنگ ہو رہی تھی اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ بھی رفتہ رفتہ اپنے آخری دور میں پہنچ رہی تھی۔ روس میں استالین کی راہنمائی میں فاشزم کے خلاف جنگ بھی آخری مرحلوں میں تھی۔ ان سب حالات نے مخدوم کے سیاسی شعور کو جگایا۔ رومانی نظموں کے ساتھ ہی ساتھ باغی جیسی نظم ظہور میں آئی جس میں دوسرے ترقی پسند شاعروں کی طرف ایک اچانک بھڑک اُٹھنے والی آگ اور آواز اور الفاظ میں زبردست شور و غوغا ہے۔ باغی کا پہلا ہی بند بڑا ہنگامہ خیز ہے۔

رعد ہوں برق ہوں بے چین ہوں پارا ہوں میں
خود پرستار، خود آگاہ خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلادے وہ شرارا ہوں میں
میری فریاد پہ اہلِ دول انگشت بہ گوش
لاتبر، خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

مگر اس غم وغصہ کے ساتھ ایک نیا آئیڈیل ازم بھی آتا ہے اور ہنگامہ خیزی سے زیادہ اب بلند آہنگ رجائیت لے لیتی ہے۔ جہاں احتجاج بھی ہے۔ پرانے نظام سے شدید بے اطمینانی کا اظہار بھی مگر ساتھ ہی ساتھ ایک بہتر زندگی کا خواب بھی عیاں ہے۔ چناں چہ مشرق کی روحانی اور مادی افلاس اور فرسودگی جسے سامراجی طرح طرح سے اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ مخدوم کہتے ہیں۔

پیکر ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح حول
ایک مرگِ بے قباحت ایک بے آواز ڈھول
ایک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خوابِ اصحابِ کہف کو پا لینے والی زمیں
اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بسایا جائے گا

یہاں پیکر ماضی کا بے رنگ اور بے روح خول اور مرگِ بے قیامت اور بے آواز ڈھول زمین، موت پروردہ سامراج کے اقتدار کے دور میں پورے مشرق کے بارے میں

نہایت سچا اور موثر طنز ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ان کی آواز میں ایک ٹھہراؤ اور سنبھلا ہوا انداز اور گہری سوچ میں ڈوبا ہوا لہجہ ملنے لگتا ہے۔ اس کی بہت اچھی مثال ان کی نظم محبت کی چھاؤں، نیند، ٹوٹے ہوئے تارے، قلندر جیسی نظموں میں ملتی ہے۔ خصوصاً قلندر جو چغتائی کی بنائی ہوئی تصویر کو دیکھ کر کہی گئی۔ بہت ہی حساس جمالیاتی مذاق کا پتہ دیتی ہے جو محض شعری اظہار کی حدوں کو اور آگے لے جاتی ہے جہاں لفظ مصور کے موقلم کے خطوط اور رنگوں کی طرح مخدوم ایک اور تصویر بنا دیتے ہیں۔ یعنی مخدوم کے اندر پہلے کا نوخیز ہنگامہ آرا اور اچانک بھڑک جانے والا نوجوان ایک متفکر اور سنجیدہ تخلیقی مزاج رکھنے والا فن کار ہے

یہاں مخدوم کی شاعری اور ترقی پسندی سے متعلق ایک بحث کی طرف ضرور توجہ کرنی چاہیے۔ ہنگامی ادب کیا ہے اور پورے ادب میں اس کی قدر و قیمت ہے بھی یا نہیں۔ ترقی پسندی کا آغاز اور عروج جس زمانے میں ہوا وہ آزادی کی جدوجہد کا تھا۔ سامراج کے خلاف جذبات ساری دنیا میں اُبھرنے لگے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ سماجی اور معاشی مساوات اور استحصال سے متعلق سوالات اشتراکی نظریے کے اثر سے تیزی کے ساتھ پھیل رہے تھے۔ چناں چہ ترقی پسندی دراصل دور تک پھیلی ہوئی ایک عظیم جدوجہد کا حصہ تھی۔ خیالات کی سطح پر علم وادب اور اک کے ذریعے اس درد کی احتجاجی لے ہر طرف سنائی دیتی تھی۔ چناں چہ ترقی پسند شاعری میں یہ سب باتیں اگر آئیں تو یہ وقت کا تقاضا تھیں۔ یہ بات بھی بھولنی نہیں چاہیے کہ ترقی پسند تحریک کے لیے زمین تو پہلے سے ہی ہموار ہو رہی تھی۔ ہنگامی اور بلند آہنگ ادب تو سرسید تحریک کے زمانے سے اپنا اثر بڑھاتا جا رہا تھا۔ اقبال، پریم چند، چکبست اور اس کے بعد جوشؔ، غرض کہ وہ سب لوگ جو اس فضا میں پل رہے تھے، حساس ذہن اور اپنے عہد کے تقاضوں کا شعور رکھتے تھے اس رجحان سے متاثر تھے۔ اس کا ایک بہت

بڑا اثر مجموعی طور پر پورے سماج پر یہ ہوا کہ انسان دوستی اور ہر قسم کے ظلم کے خلاف ایک جذبہ شعر و ادب کے ذریعے ملک میں پھیلا۔ اس شاعری کا یہ امتیاز کم نہیں کہ حکومت وقت کو اس سے خوف ہوتا تھا اور اس پر پابندیاں عاید کی جاتی تھیں۔ یہ معمولی بات نہیں تھی کہ احتجاجی جلسوں میں سیاسی اجتماع میں اور عام فضا میں جو ولولہ انگیز فضا خود بخود بنتی تھی اُس میں اردو شاعری کا اور ترقی پسند شاعروں کی تخلیقات کا بہت بڑا حصہ تھا۔ مجھے آج سے پچاس سال قبل کا وہ وقت یاد آتا ہے جب پرائمری اسکول میں کلاس کے اندر جانے سے پہلے کچھ ترانے سب مل کر گاتے تھے۔ جن میں اقبال کے ترانہ ہندی کے بعد سب سے زیادہ مقبول نظم مخدوم کی تھی ''یہ جنگ ہے جنگِ آزادی'' اور اس سے ایک عجیب و غریب ولولہ پیدا ہوتا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ آزادی کی لڑائی اور ظلم کے خلاف احتجاج کی تاریخ جب بھی مرتب ہوگی اس میں اردو شاعری کے اس حصہ کو نمایاں مقام حاصل ہوگا۔ ہنگامی ادب کی یہ ہنگامی اہمیت خود اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اُسے زماں و مکاں اور تاریخ کے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر پورے ادب میں اس کی قدر و قیمت کیا ہوگی؟ اس کا جواب تو یہی ہے کہ صرف ہنگامی ادب ہی نہیں سارے کا سارا ادب اپنی جمالیاتی قدر و قیمت کی بنا پر تو جانچا ہی جاتا رہے گا۔ اس لیے نہ غیر ہنگامی ادب سارا کا سارا اس قابل ہے کہ اسے قبول کیا جائے اور نہ ہنگامی ادب سارا کا سارا اس قابل ہے کہ اُسے رد کر دیا جائے۔ اس کے بعد مخدوم کی اس شاعری پر بھی نظر ڈالیے جو نظریاتی پہلو کے باوجود آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی وہ صنف جس کی بنا پر ان کی رومانی شاعری اور سیاسی شاعری دونوں کو مقبولیت حاصل ہوئی وہ تھی موسیقیت اور غنائیت۔ لفظوں کے اندر آوازوں کا حُسن اور اُن سے برآمد ہونے والی ایک لے اُن کی ہر نظم میں ملتی ہے۔

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے
دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اُجالوں کا پیام آئے گا
آج کی رات نہ جا
زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے
آج کی رات بہت راتوں کے بعد آئی ہے
کتنی فرخندہ ہے شب، کتنی مبارک ہے سحر
وقت ہے میرے لیے تیری محبت کی نظر
آج کی رات نہ جا

اس چھوٹی سی نظم میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا احساس اور زندگی کے حسین اور دل کش رنگوں سے پیار دونوں ظاہر کرتے ہیں کہ مخدوم کے ہاں زندگی اپنے پورے رنگ روپ کے ساتھ آتی ہے۔ وہ اُسے ایک ایسی وحدت کے طور پر دیکھتے ہیں جس میں متضاد عناصر کی باہم کشمکش اُسے دل کش بناتی ہے اور اس کارزار میں شریک ہونے کی دعوت دیتی ہے۔ اسی قسم کی نظم ''چاند تاروں کا بن'' ہے جس کے یہ مصرعے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا' اُجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے چلو

'غالب' پر ان کی نظم جس پر زیادہ تر توجہ نہیں کی گئی ہے اس لائق ہے کہ اس کی طرف توجہ دی جائے کیوں کہ ان کی شخصیت اور شاعری کا آج چرچا تو پہلے سے بہت زیادہ ہے مگر غالب کو اس نقطۂ نظر سے شاید کسی شاعر نے نہیں دیکھا۔ چند شعروں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تم جو آجاؤ آج دِلّی میں
خود کو پاؤ گے اجنبی کی طرح
تم پھرو گے بھٹکتے رستوں میں
ایک ہے چہرہ زندگی کی طرح
وہ زبان جس کا نام ہے اردو
اُٹھ نہ جائے کہیں خوشی کی طرح

ہم زباں کچھ اِدھر اُدھر سارے
نظر آئیں گے آدمی کی طرح
وغیرہ وغیرہ

مخدوم کے ہاں چند نظموں کے ترجمے بھی پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں۔ ان میں ایک استالین کے بارے میں ہے جو جبول جابری کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے اور اردو تلگو شاعرہ اندرا دھن راج گیری کی نظمیں 'فاصلے' اور 'ہم دونوں' ہے۔ جو لوگ تلگو سے ناواقف ہیں اُن کے لیے یہ نظمیں نہایت دل کش تخلیق کی حیثیت رکھیں گی۔

میرے سیلابِ تخیل میں تری یادائے دوست
اس طرح تیرے گی
صبح دم تیرتا پھرتا ہے کسی جھیل میں جیسے کوئی ہنس

ان کے اس دور کی نظموں میں ابتدا کی گھن گرج نہیں۔ خرابی آنکھوں کے' اپنا شہر، رات کے بارہ بجے، سناٹا، بے درد مسیحا وغیرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے اور استعاراتی نظام کی بنا پر پہلے سے بہت مختلف ہیں۔ اُن کے ہم عصر ترقی پسند شاعروں کے ہاں یہ انداز عام طور سے نہیں ملتا۔ بلکہ شاعری کے بارے میں ان کا رویہ جو ان نظموں میں ظاہر ہوتا ہے وہ بعد کے دور کے شعرا سے بہت قریب ہے۔ ان کی ان نظموں کو پڑھتے وقت اختر الایمان یاد آتے ہیں۔ اختر الایمان کی طرح مخدوم کی شاعری بھی ظاہر آتی ہے کہ سیاست اور نظریہ سے شاعری کو کوئی بیر نہیں بلکہ اس کا قابلِ اعتنا ہونا اس پر منحصر ہے کہ فن کار کا تخلیق عمل میں وہ جس طرح جذب ہو کر آیا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال ویت نام کی عوامی جنگ سے متعلق ان کی نظم ہے۔ نظم کا عنوان ہے 'دُرّہ موت'۔

اس تباہی کی گزرگاہ سے چل
یہ کوئی رستہ ہے جس رستے میں
نہ کوئی پھول نہ پتّا
نہ کوئی پیڑ نہ پھل
اک ہیولائے سبا
حدِ نظر
جس طرف دیکھو کھنڈر

اور اس مصرعے پر ختم ہوتی ہے۔

ایسے اُجڑے ہوئے رستے سے ذرا آگے چل

ایک بات خاص طور سے قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ ترقی پسند شعرا جن میں بیش تر کسی زمانے میں غزل کو ترک کر کے نظم کو ہی اپنے اظہار کے لیے سب سے بہتر صنف سمجھنے لگے تھے۔ وہ 60 کے آس پاس یا اس سے قبل پھر غزل کی طرف واپس آئے۔ یہ زمانہ وہ ہے جب قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشتراکی حلقوں میں نظریاتی طور پر اختلافات نمایاں ہونے لگے۔ آزادی اور تقسیم ملک نے جو منظر دکھائے تھے اُن کی بنا پر بہت سے خواب پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے۔ اب ترقی پسند تحریک میں نظریاتی انتشار کے ساتھ بے یقینی آ گئی۔ کہا جانے لگا کہ ادب میں جمود آ گیا ہے۔ اس طرح کا سماں ہمیشہ غزل کو راس آیا ہے۔ جب وہ سب چیزیں جو پہلے صاف اور واضح لگتی تھیں جب دھندلا گئیں سرخ سویرا اور انقلاب آیا اور نہ کسی بات پر یقین رہ گیا تو مبہم خیالات کے اظہار کے وہی پیرائے کام آئے جنھیں زندگی میں ہر طرف بکھری

ہوئی سچائیوں کے صاف اور تفصیلی اظہار کے لیے ناکافی سمجھا جاتا تھا۔ مخدوم کی غزل عشق کی سرمستی اور حسن کی رنگینی اور موسیقیت سے سرشار ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں ایسے اشعار اس دور کی اس نظریاتی تشویش کا بھی اظہار کرتے ہیں۔

سراب ہے کہ حقیقت ہے کہ قریب
یقیں بھی ٹوٹا ہے طرزِ گماں بھی ٹوٹی ہے
سیاستِ دلِ بہ چور چور تو تھی
سیاست دل آہنگراں بھی ٹوٹی ہے
اندھیری رات کا یہ نیم باز سناٹا
گلوں کی سانس تک گلستاں بھی ٹوٹی ہے

☆☆☆

پروفیسر سیّدہ جعفر
سابق صدر شعبۂ اُردو، جامعہ عثمانیہ وحیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

عصری حسیّت اور شعری صناعی کا شاعر

بیسویں صدی کے نصف آخر میں حیدرآباد کے جن تخلیق کاروں نے اردو شاعری کی سمت و رفتار متعین کی ان میں سکندر علی وجد، شاہد صدیقی، سلیمان اریب اور مخدوم محی الدین کے نام نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ مخدوم نے محنت اور محبت کے شاعر کی حیثیت سے اپنے فن کو نئی آب و تاب، نئی معنویت اور نئی جہت عطا کی۔ تخلیقی انفرادیت اور لب و لہجے کا شخصی آہنگ شاعری میں مخدوم کی شناخت بن چکا ہے۔ کروچے نے جمالیات کے سلسلے میں نظریۂ اظہاریت سے بحث کرتے ہوئے لکھا تھا کہ حسن یا فن دراصل فرد کا اظہار ہے فن کار اپنی شخصیت کے اظہارات کے تجسیم خواہ عنوان کے وسیلے سے کرے یا اصوات کی صورت میں اس کا مقصد اپنے وجدان کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا ہے اور خارجی تمثیلات میں فن کار کی ذات کی جلوہ گری اور اس کی شخصیت کی مہک موجود ہوتی ہے۔ تجسیم و تشکیل کا یہ عمل محض اتفاقی نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے بہت سے محرکات کام کرتے رہتے ہیں۔ تخلیق کے پیچیدہ عمل میں مختلف تاثرات فن کار کی انا کو مہمیز کرتے رہتے ہیں اور چونکہ ہر شخصیت ایک علاحدہ نفسیاتی اکائی ہوتی ہے اس لیے اظہار کے پیکروں میں تنوع اور بوقلمونی پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے فن کار کی انفرادیت کا تعین ہوسکتا ہے۔ مخدوم کی شاعری اپنے انفرادی رنگ و آہنگ کی وجہ

سے اردو نظم نگاری میں ایک مخصوص آہنگ کی حامل ہے۔

1935ء کی ترقی پسند تحریک کے ساتھ جن شاعروں نے اپنے فن کو وابستہ کیا تھا ان میں سے بعض شاعروں نے اس لیے ہمارے ذہن پر ان مٹ نقش نہیں چھوڑا کہ وہ ادب اور نعرے بازی میں حد فاصل قائم کرنے میں ناکام رہے تھے۔ حقیقی فن کار کی نظر ہر وقت وقتی سوال میں ایک ابدی جواب کی جھلک دیکھتی اور دکھا سکتی ہے۔ مخدوم عصری مسائل کی روح کو سدا بہار ابدیت کے آئینے میں جلوہ گر دیکھتے ہیں، اس لیے ان کی شاعری اپنی ساری مقصدیت، اجتماعیت اور سماجی حقیقت پسندی کے باوجود اپنے اندر ایک ایسی کسک رکھتی ہے جو ہر دور میں محسوس کی جائے گی۔ مخدوم کی رومانی شاعری کے پیچھے جو سماجی احساس کارفرما ہے وہ بڑا ہی متحرک اور فعال ہے اور اسی فعالیت نے مخدوم کی رومانی شاعری کو بے جان تخیل پرستی اور خوابنا کی نہیں، ایک بے داری بخشی ہے اس لیے ان کے کلام میں زندگی کے حسن اور اس کی بدہیئتی اور حیات کے جلال و جمال دونوں کا احساس موجود ہے:

زندگی ، لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرت دیدار بھی ہے
زہر بھی آب حیات لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

مخدوم کی شاعری میں بعض ارتقائی منزلیں نظر آتی ہیں اور ارتقا کا یہ عمل شعور کی پختگی اور ادراک کی تیزی کا آئینہ دار ہے۔ اس زمانے میں بھی جب وہ ''تلنگن''، ''طور'' اور ''ساگر کے کنارے'' جیسی ہلکی پھلکی رومانی نظموں کی تخلیق کر رہے تھے ان کی انفرادیت مروجہ، فنی اقدار سے سمجھوتہ کر لینے کے باوجود نئی راہوں کا پتہ دے رہی تھی۔ ٹیگور نے اپنے

کلام میں کائنات اور انسان کے باہمی ربط اور فطرت کے سربستہ رازوں کو وجدان کی رہنمائی میں سمجھنے کی کوشش کی تھی اور اس سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے فن کار متاثر ہوئے تھے۔ مخدوم کا بھی اس سے اثر پذیر ہونا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔ ٹیگور سے اثر پذیری نے ان کی محاکات نگاری، علائم اور ان کی امیجری کو ایک خاص زاویے سے متاثر کیا تھا۔ مخدوم نے مظاہر قدرت اور مناظر فطرت سے پس منظر کا کام لے کر اپنی رومانی نظموں کو ایک خاص معنویت اور ایمائیت عطا کی ہے۔ یہ سبک، رسیلی اور ترنم ریز نظمیں ایک ایسی رومانیت سے سرشار ہیں جن میں مادی پس منظر اور ارضی زندگی کے جیتے جاگتے حقائق کا احساس موجود ہے۔ ارضیت کا یہ عنصر مخدوم کی اس ابتدائی شاعری کو جو بظاہر محض حسن کے نغموں کی شاعری ہے، واقعیت عطا کرتا ہے۔ ان نظموں میں بار بار اس کا احساس ہوتا ہے کہ شاعر نئی بات کہنے کے ''درپے'' نہیں بلکہ اس کی انفرادیت ایک نئے لب و لہجے کی تشکیل پر اکسا رہی ہے۔ مخدوم کی عصری حسیّت نے ان کی رومانیت کو گہرائی اور وسعت عطا کی ہے۔ ''اوس میں بھیگتے'' اور ''چاندنی میں نہاتے ہوئے''، ''دو بدن'' اس لیے ان کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں کہ ''پیار حرف وفا'' ہے۔ مخدوم محبت کی زندگی کی ایک بلیغ علامت کے روپ میں تہذیبی رشتوں اور سماجی بنیادوں کے چوکھٹے میں دیکھتے ہیں اس لیے ان کی رومانی نظموں کی تان اس تصور پر ٹوٹتی ہے:

یہ بتا چارہ گر
تیری زنبیل میں
نسخۂ کیمیائے محبت بھی ہے
کچھ علاج و مداوائے الفت بھی ہے

شعرائے حیدرآباد تک آزادی اور انقلاب کی وہ روشنی پہنچ رہی تھی جس کا سلسلہ 1857ء کی جدوجہد سے ہوتا ہوا تلنگانہ تحریک تک پہنچتا تھا۔ یہاں تک کہ آصف جاہی سلسلے میں درویش شاہ نظام الدین کی عطا کی ہوئی ساتویں روٹی بھی معدوم ہونے لگی۔ حیدرآباد کے حساس اور باشعور فن کار اس فضا میں گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ انھیں نئے انقلابی تصورات کے متلاطم سمندر میں شخصی حکومت کا سفینہ غرق ہوتا نظر آ رہا تھا مخدوم نے کہا تھا:

لرز لرز کے گرے سقف و بام زرداری
ہے پاش پاش نظام ہلاکو و زاری
پڑی ہے فرق مبارک پہ ضربت کاری
حضور آصفِ سابع پہ ہے غشی طاری

مخدوم کا سماجی عقیدہ یہ تھا کہ ''وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا دشمن جس میں تاراج نہ ہو اس لیے اپنی ایک نظم ''موت کا گیت'' میں وہ کہتے ہیں:

پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی
بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

سامراجیت کے خلاف عملی جدوجہد اور اشتراکی مقصد کے حصول کے لیے تخریبی رویے کی پذیرائی کی جھلک اس دور کے ادب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ محنت و محبت کے شاعر مخدوم کی نظم ''کہو ہندوستاں کی جئے'' پرستاران وطن کا نعرہ بن گئی تھی۔ یہ پوری نظم برطانوی

سامراج سے ٹکر لینے اور ''کنجشک فرومایہ'' کو ''شاہین'' سے لڑا دینے کے آہنی عزم و اعتماد کی غماز ہے۔ 1946ء کے بعد کا زمانہ ریاست حیدرآباد میں مزدور تحریک کے عروج کا دور ہے۔ تلنگانہ میں کسان تحریک کا آغاز، قولداروں کی بے دخلی اور زمینات پر قبضوں کے ردعمل کے طور پر ہوا تھا۔ حکومتِ حیدرآباد نے اکتوبر 1946ء میں اس تحریک کے دور رس نتائج کے پیش نظر اشتراکی طرز فکر اور حریت دوستی کے اظہار پر پابندی عائد کردی تھی۔ چناں چہ مخدوم، روپوش ہوگئے۔ نظام کے ممالک محروسہ کا ایک چھوٹا سا گاؤں پرٹیلا تھا یہاں روپوش حریت پسندوں نے قبضہ کرلیا اور بقول راج بہادر گوڑ مخدوم محی الدین کے ہاتھوں ''جمہوریہ پرٹیلا'' کا افتتاح عمل میں آیا۔ اس سیاسی تناظر کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ اسی فضا میں تحریک آزادی کی شمعیں فروزاں رہیں۔ کرشن چندر نے اپنی کتاب ''جب کھیت جاگے'' میں اس تلنگانہ تحریک کے پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ مخدوم اپنی نظم ''بھاگ متی'' میں دکن کو انقلاب کی سرزمین سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی ، رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

اس وقت تلنگانہ انقلابی سرگرمیوں کا ایک زبردست محاذ بن گیا تھا اور پورے ہندوستان کے حریت پسندوں کے لیے مینارِ نُور بنا ہوا تھا۔ جنوب سے طلوع ہونے والے اس سورج کی کرنیں ہندوستان کے مختلف حصوں تک پہنچ رہی تھیں اس لیے مخدوم نے تلنگانہ کو ''امام تشنہ لباں'' اندھیری رات کے سینے میں ''مشعلوں کی برأت''، ''مہر بغاوت'' اور ماہِ نجات'' سے تعبیر کیا ہے۔

''سرخ سویرا'' کے بعد شاعری کے لہجے، مزاج اور آہنگ کا تفاوت مخدوم کے الفاظ میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے۔ عملی سیاست سے مخدوم کی سرگرم وابستگی سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ زندگی کا مطالعہ محض سیاسی نقطۂ نظر سے کر سکتے ہیں، درست نہیں۔ مخدوم کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کی شاعری میں خاصا توازن اور سنبھلی ہوئی کیفیت ملتی ہے۔ مخدوم کی شاعری میں ایک منزل اس وقت آتی ہے جب بقول اسٹیفن اسپنڈر انقلابی غور و فکر کے نتیجے کے طور پر سماج کی نئی طاقتیں اپنے آباد و اجداد کے پرانے مکانوں کو ڈھا کر باہر نکلنے کی ترغیب دے رہی تھیں۔ اس وقت ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کی فضا میں ہر طرف بارود کی بو آرہی تھی اور جنگ کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس وقت کے عالمی ادب میں ذہنی کرب، انتشار، اداسی، اور خوف و ہراس کا احساس ملتا ہے۔ آڈن کی ''ایج آف انگزائٹی'' (Age of Anxiety)، ''میل ڈی لیوس'' کی پراثر نظموں، ہیمنگ وے اور اردو نثا کی تخلیقات میں خلفشار اور بے چینی کا بیکراں احساس ملتا ہے۔ مخدوم نے ناآسودگی، تشکیک اور عالمی کساد بازاری کے اس پرآزمائش دور میں انسانیت کے لیے خطرہ ضرور محسوس کیا لیکن بہتر ہیئت اجتماعی کی تمنا نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ''حویلی''، ''جہانِ نو''، ''مشرق''، ''انقلاب''، ''ستارے'' اور ''سپاہی'' میں ایک ایسی رجائیت ہے جو مستقبل کے یقین اور کامیاب مقصد حیات سے وابستگی کا احساس پیدا کرتی ہے:

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی ستاروں کا پیام آئے گا

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم کی شاعری میں ایک مخصوص نقطۂ نظر سے والہانہ وابستگی کا جذبہ، محبوب کے پیکر میں ڈھل گیا ہے اور ان کی انسان دوستی کو غم دوراں نے غم جاناں بنا دیا ہے۔ خارجی زندگی کا یہ مظہر داخلی دنیا کا جز بن کر ان کی پوری شاعری پر چھا گیا ہے:

آج تو تلخی دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم یاس سر رہ گزار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے
دار سے گزرے تری راہ گزر سے پہلے
کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہلک
درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

یارِ مسیحا نفس ''ساقی گل رو''، ہم سفر بہار ''زلف چلیپا''، ''میرا ثبات میری کائنات میری حیات''، اور ''یار غم گسار'' اظہار کے ایسے بھرپور پیکر ہیں کہ ''انداز قد'' کی پہچان مشکل معلوم ہوتی ہے۔ مخدوم نے 1943ء سے 1951ء تک سوائے ''تلنگانہ'' کے کوئی اور نظم تخلیق نہیں کی۔ اس زمانے میں وہ ''دیارِ ہند کی محبوب ارض چین'' میں ''تلنگانہ جدوجہد'' سے عملی طور پر وابستہ تھے۔ تاریخ اور سیاست کے اس اہم موڑ پر ''مخدوم''، ''خاموش تماشائی''

نہیں بن سکتے تھے وہ مشاہدے کو مجاہدے کی منزل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ بعد کے دور میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مخدوم سماجی اور سیاسی زندگی کے تجربے کو شعری تجربے سے ہم آہنگ بنانے میں پوری طرح کامیاب ہو گئے ہیں چناں چہ ان کی نظم ''تلنگانہ'' میں خلوص اور جذبے کی شدت کا اظہار ایک پر اثر شعری تجربہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے:

امام تشنہ لباں خضر راہ آبِ حیات
اندھیری رات کے سینے میں مشعلوں کی برات
میرا شباب مری کائنات میری حیات
سلام مہر بغاوت سلام ماہِ نجات

مارچ 1951ء میں مخدوم گرفتار ہوئے اور انھیں سنٹرل جیل، حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ جیل کی تنہائی میں جدوجہد کی بے اثری کے غم، عوام سے دوری کے احساس اور ''زندگانی کی اک ایک بات کی یاد'' ان سب عوامل نے مل کر شعری تخلیق کو اکسایا اور شعری تاثرات کی باز تعمیر کی جس کے نتیجے میں اردو شاعری کو ''قید'' جیسی خوب صورت نظم ملی۔ قید کئی اعتبارات سے مخدوم کی شاہ کار نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس نظم میں خیال کی رفتار جذبات کی نرم روی سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ رابن اسکالٹن اپنی کتاب ''دی پوئٹک پیٹرن'' (The Poetic Pattern) میں کہتا ہے کہ اچھی نظم میں ڈرامائی کیفیت کے ساتھ ساتھ معنوی ارتقا اور آواز کا زیر و بم بھی ضروری ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے مخدوم کی یہ نظم ایک مکمل شعری اکائی کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ اشاراتی نظم مخدوم کی فن کارانہ صلاحیتوں کا ایک کامیاب اظہار ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے بھی ''قید'' مخدوم کی آزاد نظموں میں ایک منفرد آواز محسوس ہوتی ہے۔ خیال کے آغاز، پھیلاؤ اور نقطہ اختتام کو شاعر نے جمالیاتی تاثر کے سہارے پروان چڑھایا ہے۔ مخدوم کی آواز میں ایک گمبھیر کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور

وہ معروضی ربط باہم جسے ٹی۔ ایس۔ الیٹ نے ''Objective Correlation'' سے تعبیر کیا ہے پوری طرح شاعر کی گرفت میں محسوس ہوتا ہے نظم ''قید'' کا یہ حصہ جو مخدوم کی شعری صناعی کا ایک اچھا نمونہ ہے ملاحظہ ہو:

رات ہے رات کی تاریکی ہے تنہائی
دور محبس کی فصیلوں سے بہت دور کہیں
سینۂ شہر کی گہرائی سے گھنٹوں کی صدا آتی ہے
چونک جاتا ہے دماغ
جھلملا جاتی ہے انفاس کی رو
جاگ اٹھتی ہے مری شمعِ شبستانِ حیات
زندگانی کی اک اک بات کی یاد آتی ہے

مخدوم کی شاعری میں حسیاتی محاکات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے یہاں پیکر تراشی یا امیجری زیادہ تر سماعی ہے لیکن مخدوم کے شاہ کار امیجیز وہ ہیں جو سماعی اور بصری ادراک کا حسین امتزاج نظر آتے ہیں ان امیجیز کی خوبی یہ ہے کہ جذبے اور الفاظ کے ترنم میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ ہم آہنگی شعر کی معنویت میں اضافہ کرتی ہے۔ مخدوم کی ایک کامیاب نظم ''چاند تاروں کا بن'' جو اردو نظم نگاری کی تاریخ میں ایک خوب صورت اضافہ ہے۔ ہماری نسل کی پچھلی بیس پچیس سال کی ذہنی اور جذباتی کشمکش، سیاسی جدوجہد، ہمارے سنہرے خوابوں اور ان کی بھیانک تعبیروں اور ہماری اجتماعی تمناؤں کی ایک مکمل اور جذباتی تصویر ہے جس میں حقیقت کا احساس بھی ہے اور جمالیاتی رچاؤ بھی۔ آزادی کے بعد اس موضوع پر لکھی ہوئی اور بہت سی نظمیں مل جاتی ہیں لیکن مخدوم کے ایمائی انداز ان کی ''انقلابی رمزیت'' اور فن کارانہ بصیرت نے اس نظم کو ایک حسین اور وقیع تخلیق بنا دیا ہے۔

ہر نظم اپنے طور پر ایک مکمل شعری وحدت ہوتی ہے جس میں فنی تقاضوں کے احساس کے علاوہ لفظوں کے مزاج کی پرکھ اور اظہار کے آہنگ کو بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں 1936ء کے بعد سے علامات و اشارات کی اہمیت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا۔ اس عہد کی نظم نگاری میں اٹلی کے فیوچرازم کے رجحان، بلجیم کے مصوروں کی پوسٹ امپریشنسٹ تحریک (Post Impressionist Movement) اور فرانسیسی تمثیل نگاروں کی سمبالزم (Symbolism) کی تحریک کے اثرات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ ان تحریکوں میں انداز نظر کے تفاوت کے باوجود ایک مشترکہ 'عنصر ''اشاراتی انداز'' کا ہے۔ اس اشاراتی انداز کو مخدوم نے ''چاند تاروں کا بن'' میں سلیقے اور دیدہ وری کے ساتھ برتا ہے۔ طویل نظموں کی ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ایک خاص موڑ اور لب و لہجے کو بہت دیگر اور بہت دور تک بنانا پڑتا ہے اور جذباتی کشاکش اور تناؤ کو ایک خاص سطح اور درجے پر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مخدوم کی نظم ''چاند تاروں کا بن'' اس لیے بھی صناعی کا ایک اچھا نمونہ بن گئی ہے کہ اس میں فن کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس نظم میں ہماری قومی زندگی کے تین لمحات ماضی، حال اور مستقبل کو ایک صداقت کے تین پہلوؤں کی طرح برتا گیا ہے۔ نظم کا پہلا حصہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بین الاقوامی سطح پر ہر اس قوم کی داستان معلوم ہوتا ہے جو جدوجہد اور کشمکش کے ذریعے سے اپنے نصب العین تک پہنچی ہے۔ شاعری میں آپ بیتی اور جگ بیتی اور خصوص و عموم کے درمیان نقطۂ اتصال کی تلاش کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں:

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر

مخدوم نے اپنی نظموں میں قومیت کے تصور کو بین الاقوامی وسعت سے آشنا کیا ہے۔ یہاں تاریخی رفتار اور آفاقیت کا اظہار ایک وحدت کی شکل میں ہوا ہے۔ مخدوم کی انسان دوستی ابتدا ہی سے قومیت کی تحدیدوں کو توڑ دینا چاہتی تھی کیوں کہ جغرافیائی حد بندیوں سے قطع نظر ساری دنیا میں انسان کے بنیادی مسائل تقریباً یکساں ہیں۔ ''چاند تاروں کا بن'' میں آفاقیت کے عناصر جاری و ساری ہیں۔ اس نظم میں آگے چل کر شاعر خوابوں کی تعبیریں ڈھونڈنے لگتا ہے۔ یہ بھی تاریخ کا ایک جبر تھا کہ ''پیار کی منزلیں''، ''دار کی منزلیں'' بن گئیں اور وہ سویرا جس کا انتظار تھا ''شب گزیدہ'' ثابت ہوا:

کچھ اماماں صدمکر و فن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوک زباں
خونِ نور سحر پی گئے

نظم نگاری اظہار خیال کا ایک مخصوص فن ہے جس کی تشکیل اور ترتیب میں کئی ابعاد کا یکجا ہونا ضروری ہے۔ ان کے ناقص تناسب یا غلط ترتیب سے تخلیق اپنے ادبی حسن سے محروم ہو جاتی ہے۔ مخدوم کی شاعری جدید و قدیم ادب کی صالح اور صحت مند روایات کی پذیرائی کا بہترین نمونہ ہے۔ انھوں نے شاعری کے روایتی اظہارات کو بڑے سلیقے کے ساتھ نئے اندازِ فکر اور جدید طرز ترسیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ مخدوم کی ترقی پسند شاعری کا خمیر اردو شاعری کی بہترین روایات سے اٹھا ہے اس لیے طرز ادا کی تعمیر و تشکیل اور صورت گری

میں یہ دونوں عناصر کارفرما نظر آتے ہیں ''گلوئے زہرہ''، ''خضر راہ آب حیات''، ''امام تشناں لباں''، اور ''ادائے زلیخائی'' جیسے ابلاغ کے پیکر محض شعر کی سجاوٹ کے لیے نہیں لائے گئے ہیں۔ وہ قدیم ادب پاروں کے بلیغ اشارات سے ایک خاص فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ مخدوم کی شاعری اپنے ادبی خلوص، اظہار پر قدرت اور موضوع و طرز ادا کی صوتی ہم آہنگی کی وجہ سے بھی ایک منفرد آواز معلوم ہوتی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر رحمت یوسف زئی
سابق صدر شعبۂ اُردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، حیدرآباد

مخدوم کی شعریات اور تصور جمال

حیدرآباد کے ساتھ مخدوم کا نام ایسے ہی جُڑا ہے جیسے چار مینار کے ذکر کے بغیر حیدرآباد ادھورا ہے۔ حیدرآباد کی ادبی، سماجی اور سیاسی زندگی کا ذکر چھڑے تو مخدوم کا ذکر ناگزیر ہے۔ حیدرآباد کے تمام شعراء میں سب سے زیادہ چاہا جانے والا شاعر مخدوم ہی تو ہے۔ مخدوم کی سیاسی زندگی، ان کے سیاسی افکار سے ہٹ کر ان کی شخصیت میں جھانک کر دیکھیے تو ایک سیدھا سادا، سچا، محبت کرنے والا، دوستوں پر جان نثار کرنے والا، حسن و جمال کی قدر کرنے والا شخص مسکراتا، قہقہے لگاتا نظر آئے گا۔ سیاسی زندگی کے نشیب و فراز کے باوجود مخدوم کے چہرے کی ملکوتی مسکراہٹ ہمیشہ اپنا جادو جگاتی رہی۔ انھوں نے زندگی کو اپنے انداز سے برتا۔

انسان عجیب و غریب فطرت کا حامل ہے۔ ناہمواری، تضاد اور پیچیدگی اسے ہمیشہ ناپسند رہی۔ لیکن انسان کی مجبوری یہ ہے کہ ناہمواری تضاد اور پیچیدگیوں کے بغیر اس کی زندگی ادھوری سی لگتی ہے۔ انسان بنیادی طور پر حسن پرست ہے۔ قرآن کہتا ہے ''اللہ جمیل ویحب الجمال'' اور ظاہر ہے کہ پروردگار نے انسان کو اپنی چند خصوصیات سے متصف کر کے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا۔ تو اگر خدا کو جمال پسند ہے تو انسان کو بھی جمال پسند ہونا لازم ہے۔ جمال اور ناہمواری ایک دوسرے کی ضد

کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن دل چسپ پہلو یہ ہے کہ انسان ناہمواریوں اور تضادات کو کچھ اس طرح اپنے تصرف میں لے آتا ہے کہ اپنی ناہمواریوں اور تضادات کے بطن سے حسن جنم لیتا ہے۔ بیکن نے تناسب کے انوکھے پن میں حسن کو محسوس کیا تھا۔ یہی انوکھا پن ہے جو ایک خوب صورت اور سجے ہوئے ڈرائینگ روم میں اک خاص سلیقے سے رکھے گئے کیکٹس یا گُل دان میں معمولی گھاس کی آڑی ترچھی پتیوں کو ایک خاص انداز میں لگانے سے دل کشی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ اسی لیے کانٹ کہتا ہے کہ حسن دراصل انسان کی نظر میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ مخدوم بھی حسن پرست تھے۔ وہ بھی حسن کی لذتوں سے ہم کنار ہونے کا جذبہ رکھتے تھے۔ حسن کو محسوس کرنے کی صلاحیت ان میں بے پناہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھی جابجا ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں انھوں نے حسن کی مختلف جہتوں کو اپنے استعاروں اور علامتوں سے اجاگر کیا۔ مخدوم بنیادی طور پر ترقی پسند تھے۔ اس کے باوجود مخدوم نے غزل کو سینے سے لگائے رکھا۔ غزل کا جادو ہی کچھ ایسا ہے کہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ مخدوم غزل کے منکر نہ تھے۔ کیوں کہ غزل میں جمالیاتی عنصر کسی اور صنف کے مقابلے میں زیادہ خوب صورتی سے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ ایجاز اور اختصار کے ساتھ لطیف اور نازک جذبات میں ہل چل پیدا کرنے کا کام جس خوب صورتی سے غزل کا شعر انجام دے سکتا ہے اس طرح شاید کسی اور صنف کے لیے ممکن نہیں۔ مخدوم اس رمز سے واقف تھے اسی لیے اپنی جمالیاتی حسن کی تسکین کے لیے انھوں نے غزل کی دیوی کو بھی وسیلہ بنایا چناں چہ غزل کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل

لیکن غزل سے ہٹ کر ان کا تصور جمال نظموں میں بھی کھل کر سامنے آتا ہے۔ حسن کا ایک لازمی نتیجہ کیف و سرور بھی ہے۔ مخدوم اسی کیف و سرور کے شیدائی ہیں جو حسن کے توسط سے ذہنوں کو اسیر کر لیتا ہے۔ ان کی ایک نظم نورس کے دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

حوروں کے بہشتی نغموں سے جو راگ بنے وہ راگ ہے وہ
جس سے کہ کلیمی ملتی ہے کچھ ایسی ہی اک آگ ہے وہ

ایک اور نظم سناٹا کی کچھ سطریں ملاحظہ کیجیے:۔

کوئی دھڑکن / نہ کوئی چاپ / نہ سنجل / نہ کوئی موج / نہ ہلچل / نہ کسی سانس کی گرمی / نہ بدن / ایسے سناٹے میں اک آدھ تو پتا کھڑکے / کوئی پگھلا ہوا موتی / کوئی آنسو / کوئی دل / کچھ بھی نہیں / کتنی سنسان ہے یہ راہ گذر / کوئی رخسار تو چمکے' کوئی بجلی تو گرے

مسائل کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں شاعر نے کس خوب صورتی سے اپنی شعری جمالیات کی عکاسی کی ہے۔اسی طرح نظم وقت، بے درد مسیحا میں وہ کہتے ہیں ۔

ہلکا ہلکا سا وہ اڑتا ہوا گالوں کا گلال
بھینی بھینی سی وہ خوشبو' کسی پیراہن کی

تو بظاہر یہ فرار کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نامساعد حالات سے نمٹنے اور برداشت کرنے کا ایک طریقہ سمجھاتے ہیں۔وہ خیر وشر کے روایتی پیمانوں سے ہٹ کر اپنی ایک نئی راہ تلاش کرتے ہیں کہتے ہیں ۔

بے صحبت رخسار اندھیرا ہی اندھیرا گو جام وہی مئے وہی میخانہ وہی ہے

وہ تلقین کرتے ہیں کہ ۔

ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی تو بجائے ساز الفت اور گائے زندگی

مخدوم کا تصور حسن آفاقیت لیے ہوئے ہے۔وہ حسن کو زمانے پر محیط دیکھتے ہیں۔کہتے ہیں ۔

دلوں کی تشنگی جتنی' دلوں کا غم جتنا اسی قدر ہے زمانے میں حسن یار کی بات

اور اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ۔

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات

مخدوم نے اپنے جذبات اور احساسات کو عام روزمرہ اور سلیس انداز میں ظاہر کیا۔ اسی لیے ان کے جمالیاتی تصور سے سبھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔اور ان کے اظہار میں پوشیدہ پیغام بھی آسانی سے دلوں میں اتر جاتا ہے۔چاند تاروں کا بن سے یہ مصرعے دیکھیے ۔

ہمدمو / ہاتھ میں ہاتھ دو / سوئے منزل چلو / منزلیں پیار کی / منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی / دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھا کر چلو

تو قاری پر ایک عجیب قسم کا جذبہ طاری ہو جاتا ہے۔مخدوم سادگی میں بھی حسن پیدا کرنے پر قادر تھے ان کا ایقان تھا کہ سادگی میں جو حسن ہے وہ پیچیدہ اظہار میں نہیں لیکن ان کی سادگی میں پوشیدہ معنویت قاری کے دل کو قابو میں کر لیتی ہے۔

مخدوم حسن فطرت کے ساتھ حسن انسانی کو بھی محسوس کرتے اور اپنی تخلیقات میں نمایاں کرتے ہیں۔ان کی مشہور نظم چارہ گر سے یہ مصرعے دیکھیے ۔

اوس میں بھیگتے' چاندنی میں نہاتے ہوئے
جیسے دو تازہ رو تازہ دم پھول پچھلے پہر
ٹھنڈی ٹھنڈی سبک رو چمن کی ہوا
صرف ماتم ہوئی
کالی کالی لٹوں سے لپٹ کر گرم رخسار پر
اک پل کے لیے رک گئی

اور یہ شعر بھی دیکھیے ۔

ہجوم بادہ وگل میں ہجوم باراں میں　　کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لیے

اک شعر یہ بھی ہے کہ ۔

کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک　　درِ قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لیے

جب کوئی شاعر اپنی تخلیق میں حسن کی تصویر کشی کرتا ہے تو اس کے دو مقاصد ہوتے ہیں ' پہلا تو یہ کہ وہ خود حسن کو محسوس کرنا چاہتا ہے ۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ اپنے احساس حسن سے قاری کو بھی لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرنا چاہتا ہے ۔ مخدوم کے ہاں یہ دونوں پہلو نظر آتے ہیں ، یہ شعر دیکھیے ۔

اک بہکتی بہکتی ہوئی رات ہے لڑکھڑاتی نگاہوں کی سوغات ہے
پنکھڑی کی زباں پھول کی داستاں اس کے ہونٹوں کی پرچھائیاں دوستو

مخدوم کے ہاں حسن کبھی استعارے اور کبھی علامت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور جب وہ حسن کی پیکر تراشی کرتے ہیں تو تمام خدوخال ابھر کر سامنے آجاتے ہیں ۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کی پیکر تراشی میں جنسی جذبہ نہیں بلکہ ایک انبساط کی کیفیت ہوتی ہے ۔ یہ دو شعر ملاحظہ ہوں ۔

وہ خم گردن ' وہ دست ناز ' وہ ان کا سلام
ابروؤں کا وہ تکلم ' وہ نگاہوں کا پیام
بولتی آنکھوں کا رس ' گل رنگ عارض کا جمال
مسکراتا سا تصور ' گنگناتا سا خیال

یہ گنگناہٹ ایک الوہی انبساط کی وجہ سے ہے ۔ اس میں جنسی جذبات کا دخل نہیں ۔

دراصل مخدوم حسن پرست ہیں ۔ بوالہوس نہیں ! اور اسی لیے ان کے اظہار میں بے ساختگی کے ساتھ پیکر تراشی کا عمل عروج پر نظر آتا ہے ۔ اردو شاعری کا ایک اہم عنصر حسن وعشق کا اظہار ہے ۔ مخدوم بھی اس سے دامن کشاں نہیں ۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ روایت پرست تھے ۔ بلکہ انھوں نے روایات کے بطون سے اپنے استعارے وضع کیے اور انھیں اپنے مخصوص انداز میں استعمال کیا ۔ ان کی ایک نظم جانِ غزل کے ابتدائی مصرعے ملاحظہ کیجیے ۔

اے دلِ نارسا آج اتنا مچل / مست آنکھوں کی جھیلوں میں کھلنے لگیں آنسوؤں کے کنول /
مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل / آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم /
آج دل کھول کر مسکرا چشم نم

دیکھیے ۔ زندگی کی گہما گہمی ، وقت کے تیز بہاؤ اور مصائب سے بھرپور مسائل کے درمیان شاعر کس طرح اپنے لیے سامانِ تسکین فراہم کر رہا ہے ۔

دوشیزگی کا ایک وصف شوخی اور الھڑ پن بھی ہے تبھی تو حسن اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ ابھرتا ہے ۔ مخدوم اپنی شعری تخلیقات میں اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ حسن کی تصویر کشی میں شوخی اور الھڑ پن کا بھی عنصر موجود رہے ۔ ان کی نظم جوانی کے یہ دو شعر دیکھیے ۔

اعضا میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں　　اعصاب میں پارہ ہے تو بجلی ہے نظر میں
آنے لگی ہر بات پہ رک رک کے ہنسی اب　　رنگین تموج سے گراں بار ہوئے لب

مخدوم کی لفظیات ' تشبیہیں ' استعارے اور علامتیں جذبات اور احساسات کی ایک وسیع کائنات ہیں ۔ اور اس کائنات کے سفر میں وہ اکیلے نہیں ہیں ۔ ان کے ساتھ ان کا قاری بھی شامل ہو جاتا ہے ۔ کاسۂ دریوزہ گری ، شمعِ شبستان خیال ، نسخۂ کیمیائے محبت ، رات کی تلچھٹیں ، کام دیو کی کمان ، جسم کا سورج اور ایسی بے شمار تراکیب مخدوم کی شعریات کا اہم جزو

ہیں، جن سے نہ صرف وہ پیکر تراشتے ہیں بلکہ اس عمل میں وہ قاری کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ مخدوم کی جمالیات مشرقی اقدار سے منسلک ہے۔ انھیں ہندوستان اور خصوصاً دکن کی مٹی اور یہاں کے ذرّے ذرّے میں بکھرے ہوئے حسن سے بے پناہ محبت ہے۔ وہ مغربی لبادوں پر ہندوستانی ملبوس کو اہمیت دیتے ہیں۔ غازہ اور لپ اسٹک سے سجے چہرے کی بجائے سادہ اور سرخ لب و رخسار انھیں زیادہ عزیز ہیں۔ انھوں نے مصنوعی زندگی کو کبھی پسند نہیں کیا، وہ حقیقت اور اصلیت کے قائل ہیں۔ یہ شعر دیکھیے ؎

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزہ آخر شب
اور بھی سرخ ہے رخسارِ حیا آخر شب

اور اسی غزل کا شعر ہے ؎

اسی انداز سے پھر صبح کا آنچل ڈھلکے
اسی انداز سے چل بادِ صبا آخر شب

خالص ہندوستانی مزاج کی پیکر تراشی ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں ؎

لطف سجدوں میں آ رہا ہے مجھے
چھپ کے کوئی بلا رہا ہے مجھے
چوڑیاں بج رہی ہیں ہاتھوں کی
آئی آواز اس کی باتوں کی
آ رہا ہے غبارِ نور بدن
پھیلتی جا رہی ہے بوئے دہن
موج تسنیم و کیف خُلدِ بریں

جگمگاتا بدن چمکتی جبیں
اپنے آنچل میں منھ چھپائے ہوئے
نغمے پازیب کے جگائے ہوئے
بختِ خفتہ مرے جگاتے ہوئے

یہ صرف چند پہلو ہیں جو مخدوم کی شعری جمالیات کی ہلکی سی عکاسی کرتے ہیں۔ مخدوم بنیادی طور پر حسن پرست ہیں۔ اور ان کا احساس جمال ہر وقت تازہ و توانا ہے۔ نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے اپنے احساس جمال کو زنگ آلود یا گرد آلود ہونے نہیں دیا۔ ان کی احتجاجی شاعری میں بھی جمالیاتی عنصر جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ مخدوم ترقی پسند تھے، مخدوم انقلاب کے علم بردار تھے لیکن جب وہ انقلاب کے نغمے گاتے ہیں تب بھی ان کے ہاں حسن اور احساس جمال کا غیر معمولی درک نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ کائنات کی ہر شئے میں سے حسن کھوج نکالتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور شاید یہی فلسفہ جمالیات کا مرکزی نکتہ ہے۔

☆☆☆

پروفیسر خالد سعید

صدر شعبۂ اُردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

شاعرِ شکست نو روصَدا

عام طور سے مخدوم محی الدین کو ''محبت اور محنت'' کا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ کسی شوخ نے تجنیس محرفہ سے کام لیتے ہوئے یہ لقب دے رکھا ہو۔ لیکن جب ''بساط رقص'' کا دوسرا ایڈیشن نظروں سے گزرا تو وجہ سمجھ میں آئی۔ بات یہ ہے کہ ان کا کلیات ''بساط رقص'' جسے جشن مخدوم کمیٹی نے ان کے جیتے جی شائع کیا تھا، جو ''محبت اور محنت'' کے نام معنون کیا گیا ہے، تو یاروں نے ان دو استعاروں کو ان کی فکر اور شعر وسخن کے دو بنیادی محور جان لیا۔ دوسری وجہ یہ کہ خود مخدوم بھی ان دو بنیادی استعاروں پر عمل پیرا رہے ہیں۔ لہٰذا لوگوں کا ان دو لفظوں پر یقین کر لینا کچھ ایسا غلط بھی تو نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ واقعتاً درست ہے؟ جب ہم ان کے تینوں شعری مجموعوں کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو صورت حال کچھ بدلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

میرے پیش نظر مخدوم کے تینوں مجموعہ ہائے کلام کے پہلے یا دوسرے ایڈیشن کی نقول موجود ہیں۔ سرخ سویرا کا پہلا ایڈیشن، جسے اشاعت گھر حیدرآباد نے 1944ء میں شائع کیا تھا۔ دوسرے مجموعۂ کلام ''گل تر'' کا پہلا ایڈیشن، مکتبۂ صبا نے حیدرآباد سے 1961ء

میں شائع کیا۔ اور آخری مجموعۂ کلام، کلیات کے طور پر جشن مخدوم کمیٹی نے پہلی بار 1966ء میں شائع کیا تھا، اس کا دوسرا ایڈیشن، ادبی ٹرسٹ والوں نے 1970ء میں شائع کیا تھا۔ اسی کلیات کے ایڈیشن آج بھی چلن میں ہیں۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے آ پڑی کہ مخدوم کے ہر شعری مجموعے کے ہر ایڈیشن میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں پائی جاتی ہیں، جو مخدوم کی فکر وفن کے مطالعے کے ضمن میں ممد ومعاون ہیں۔ کچھ تخلیقات پچھلے ایڈیشن میں نہیں پائی جاتیں، انھیں اگلے ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے یا نکال دیا گیا ہے۔ مثلاً سرخ سویرا کے پہلے ایڈیشن میں نظمیں ''نیند، تلنگانہ اور تماشائی'' نہیں پائی جاتیں۔ یہ نظمیں 'گل تر' کے پہلے ایڈیشن میں شامل ہیں۔ لیکن کلیات ''بساط رقص'' میں گل تر والے حصے سے انھیں نکال کر سرخ سویرا میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ نظمیں اپنے مزاج وکیفیت کے لحاظ سے واقعتاً اسی عمل کے مستحق ہیں۔ میں بھی انھیں سرخ سویرا کی تخلیقات میں شمار کرتا ہوں۔ البتہ گل تر کے مطالعے کے سلسلے میں، میں نے مکتبۂ صبا کے ایڈیشن کو ترجیح دی ہے۔ سوائے ان تین نظموں کے جو یہاں سے نکال کے سرخ سویرا میں شامل کر دی گئی ہیں۔ یعنی نظم قید سے نظم ''سناٹا'' تک کا کلام گل تر کے تحت شمار کیا ہے۔ اس ایڈیشن کو ترجیح دینے کی اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس ایڈیشن میں ہر تخلیق کے نیچے سنہ تصنیف درج ہے، جو مخدوم کی فکر اور فن کی عہد وار تبدیلی کے مطالعے میں ممد ومعان ثابت ہوئی۔ البتہ ''بساط رقص'' کی تخلیقات کا معاملہ بڑا دل چسپ ہے۔ وہ یوں کہ ادبی ٹرسٹ والوں نے مخدوم کے کلیات بساط رقص میں گل تر کے بعد والے کلام کو بھی گل تر میں گھلا ملا دیا ہے۔ اس کے علاوہ 12 اور تخلیقات کو، ''بساطِ رقص کے پہلے ایڈیشن کی بعد کی تخلیقات'' کے عنوان کے تحت شائع کیا ہے۔ میں نے اپنے مطالعے کی سہولت کی خاطر، ان ساری تخلیقات کو جو گل تر کے بعد شائع ہوئیں انھیں بساط رقص کے تحت شمار کیا ہے۔ مخدوم کے کلام کی یہ ترتیب

وتنظیم میں نے اس لیے کی ہے کہ یہ تین مجموعے مخدوم کی فکر وفن کے تین مختلف ادوار قرار دیے جا سکتے ہیں۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی شاعر کا ہر مجموعہ کلام اس کی فکر اور فن کی تبدیلی کا نمائندہ ہوتا ہے کہ جنھیں فن کار کے فکری ادوار سے تعبیر کیا جا سکے، جس طرح مخدوم کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے۔ شاید میری بات درج ذیل جدولوں کے مطالعے سے آپ پر واضح ہو جائے:

جدول الف:

سلسلہ نمبر	ادوار	پہلا دور	دوسرا دور	تیسرا دور
1	بہ اعتبار تخلیقات	آغاز سے سرخ سویرا کی اشاعت تک	'گل تر' کی اشاعت تک	بساط رقص کی اشاعت اور اس کے بعد کی تخلیقات تک
2	بہ اعتبار زمانہ	1933 سے جنوری 1944ء تک	1951ء سے 1961ء تک	1962ء سے 1969ء یعنی مخدوم کی وفات تک
3	بہ اعتبار تعداد تخلیقات	سرخ سویرا میں 50 تخلیقات	گل تر میں 33 تخلیقات	بساط رقص میں 24 تخلیقات

جدول ب:

سلسلہ نمبر	موضوعات ومضامین	ہر مجموعۂ کلام میں تخلیقات کی تعداد بلحاظ موضوع			کل تخلیقات
		سرخ سویرا	گل تر	بساطِ رقص	
1	ترقی پسند موضوعات و مضامین پر مبنی	24	7	3	34
2	رومان وعشق کے مضامین پر مبنی	15	9	6	30
3	غیر ترقی پسند موضوعات پر مبنی	11	-	3	14
4	جدید طرز احساس یا جدیدیت پر مبنی	-	1	7	8
5	غزلیں	-	16	5	21
6	کل میزان	50	33	24	107

ان دونوں جدولوں کے مطالعے سے حسب ذیل نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں۔

1۔ تخلیقات کی تعداد کے لحاظ 'سرخ سویرا' کا عہد، یعنی مخدوم کی شاعری کا پہلا دور، ان کے تخلیقی وفور کا زمانہ رہا ہے کہ مخدوم نے جتنی نظمیں اپنے پہلے دور میں کہیں، بعد کے دونوں دور کی تخلیقات کو جوڑ لیا جائے تو سرخ سویرا اور گل تر و بساط رقص کی تخلیقات کی تعداد برابر برابر ہوگی۔ یعنی جب تک وہ کمیونسٹ پارٹی سے عملاً نہیں جڑے تھے، تب انھوں نے خوب لکھا۔ اور جب پارٹی سے جڑ گئے اور جوں جوں پارٹی کی مصروفیات بڑھتی گئیں، ان کا تخلیقی عمل گھٹتا گیا۔

2۔ چوں کہ گل تر کی پہلی نظم قید کے نیچے سنہ تصنیف 1951ء درج ہے، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فروری 1944ء یعنی سرخ سویرا کی اشاعت کے بعد سے، گل تر کی اشاعت تک مخدوم کے تخلیقی عمل جاری رہنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ سوائے ان تین نظموں ''نیند (1938ء)، تلنگانہ (1947ء) اور تماشائی (1947ء) کے۔ یا تو انھوں نے لکھا نہیں۔ اگر لکھا تو تخلیقات کو محفوظ رکھا نہیں۔ یا پھر انھیں مجموعے میں شامل کرنا مناسب سمجھا نہیں۔ البتہ راج بہادر گوڑ اور عالم خوندمیری صاحبین کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ مخدوم کا تخلیقی عمل دو چار سال کے لیے تعطل کا شکار رہا۔ (1) راج بہادر گوڑ نے مخدوم کے ہاں تعطل کا زمانہ 52ء سے 55ء تک قرار دیا ہے۔ (2) جدول الف کی روشنی میں ظاہر ہے راج بہادر گوڑ کو ان کے حافظے نے دھوکا دیا ہے یا سہو کتابت 1942ء کو 1952ء لکھ دیا گیا ہو۔

3۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کوئی نوجوان شعر گوئی کا آغاز کرتا ہے تو غزل سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کرتا ہے، چوں کہ سرخ سویرا میں صرف اور صرف نظمیں شامل ہیں یعنی مخدوم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نظم نگاری سے کیا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مخدوم کا مزاج نظم گوئی سے ہم آہنگ ہے۔

4۔ مخدوم جب اپنے تخلیقی تعطل سے نکل آئے تو انھوں نے، چار چھ نظمیں کہیں، اچانک ان کی طبعیت غزل گوئی کی طرف مائل ہوئی۔ اور وہ بھی اس طور کہ گل تر کی تخلیقات کی تعداد بتاتی ہے کہ غزلوں اور نظموں کی تعداد برابر ہے۔

کیا وجہ ہے کہ ایک مزاجاً نظم گو شاعر، اچانک غزل گوئی کی طرف مائل ہوا۔ وہ بھی اپنی پختہ عمر کے زمانے میں؟ آگے گفتگو تفصیل سے ہوگی۔

5۔ مخدوم کے تخلیقی سفر میں ان کی ترقی پسندی سرخ سویرا سے بساط رقص تک پہنچتے پہنچتے بے حد گھٹ گئی۔ ان کے کل شعری سرمائے میں ترقی پسند موضوعات پر مبنی تخلیقات کی تعداد صرف 34 ہے۔ اب آپ ہی بتایے کہ کل 107 تخلیقات میں صرف 34 تخلیقات کی تعداد پر مخدوم کو محنت کا شاعر قرار دینا کہاں تک مناسب رہے گا۔ چاہے مخدوم خود کچھ بھی کہہ لیں، انھیں محنت کا شاعر قرار دے کر کہیں ہم ان کے ساتھ زیادتی تو نہیں کر رہے ہیں؟

6۔ جدول ب سے ظاہر ہے کہ رومان اور عشق پر مبنی نظموں کی تعداد 30 ہے۔ چوں کہ ان کی غزلیں سراسر عشق و حسن کے مضامین پر مبنی ہیں۔ لہٰذا غزلوں کی تعداد (یعنی 21) کو بھی حسن و عشق پر مبنی نظموں کے ساتھ جوڑ لیا جائے تو بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ مخدوم محبت کے شاعر ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مخدوم کے ہاں معاملات عشق کا بیان وقت کے ساتھ کم ہوتا نہیں گیا جس طرح انھوں نے ترقی پسند اسلوب سے نجات حاصل کر لی تھی۔

7۔ مخدوم کے ہاں جدید طرز احساس کی بھی نظمیں ملتی ہیں۔ اگر چہ ان کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ حق تو یہ ہے کہ مخدوم کی فکر ہو کہ اسلوب، ان کے ہر مجموعے کی اشاعت کے ساتھ بدلتا گیا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ سرخ سویرا ترقی پسندی سے عبارت ہے تو دوسرا مجموعہ گل تر رومان اور عشق سے۔ اور تیسرا اور آخری مجموعہ کلام بساط رقص جدید طرز احساس اور جدید اسلوب کا حامل ہے۔ یہ

تبدیلی مخدوم کی ذہنی زندگی کی فعالیت یعنی نئی فکر اور نئے رویوں کو قبولنے کی صلاحیت پر دال ہے۔

مخدوم نے خود گل تر کے پیش لفظ میں اپنی فکر اور اپنے اسلوب کے بدلاؤ کی توجیہہ وتشریح کی ہے۔ لکھتے ہیں:

''شعر کہنے کی طرح شعر پڑھنا بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ شعر کہتے ہوئے شاعر اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ بلکہ وہ اختراع بھی کرتا ہے، اپنے تجربے کی بنا پر۔ جب آپ گل تر پڑھیں تو شاید آپ اس عمل سے گزریں۔ ذہن سرخ سویرا اور گل تر کا مقابلہ بھی کرنے لگے گا۔ شاید یہ خیال بھی آئے کہ کلام کا یہ مجموعہ اپنی سج دھج، نفس مضمون، حقیقت، ندرت، جمالیاتی کیفیت وکمیت اور تاثر کے اعتبار سے سرخ سویرا سے مختلف ہے۔'' (3)

مخدوم نے سرخ سویرا اور گل تر، دونوں مجموعوں سے اشعار نوٹ کر کے دونوں کے امتیازات کو محسوس کرنے کی دعوت دی ہے۔

''یہ فرق میری نظموں میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے سابق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے۔ جو سماجی شعور اور ارتقا کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر بھی انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر قدر مشترک ہے۔'' (4)

اگرچہ مخدوم نے اپنی ترقی پسندی کو ایک طرح سے Disown کیا ہے لیکن جدیدیت کو قبولنے میں بھی انھیں تامل ہے۔ لہٰذا مخدوم کے فن اور فکر کا جائزہ، ترقی پسندی یا

غیر ترقی پسندی یا جدیدیت کے حوالوں سے لینے کی بجائے خود ان کی مقرر کردہ نشانیوں، یعنی سج دھج، نفس مضمون، حقیقت، ندرت، جمالیاتی کیفیت وکمیت اور تاثر کے حوالے سے ان کے مختلف الاسلوب کلام کے امتیازات اور اشتراکات کا جائزہ لینے کو احسن جانتا ہوں۔ سرخ سویرا کی نظمیں، اپنی سج دھج، اپنی کیفیت وکمیت اور اپنے تاثر کے لحاظ سے لفظی طمطراق، بلند آہنگ اور خارجی احساس سے عبارت ہیں۔ جب کہ گل تر اور بساط رقص کی تخلیقات نرم آہنگ اور داخلی احساس سے مملو ہیں۔ سرخ سویرا میں وہ مسائلی نظمیں ہوں کہ رومان وعشق پر مبنی نظمیں، سبھی خارجی احساس وبلند آہنگی کی حامل ہیں:

دونوں طرح کی نظمیں ملاحظہ فرمائیے:

-O-

رعد ہوں، برق ہوں، بے چین ہوں، پارا ہوں میں
خود پرستار، خود آگاہ خود آرا ہوں میں
گردن ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمن جور جلادے وہ شرارا ہوں میں
میری فریاد پہ اہل دول انگشت بگوش
لا، تبر، خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

سر پُرنخوت ارباب زماں توڑوں گا
شور نالہ سے در ارض سماں توڑوں گا
ظلم پرور، روش اہل جہاں توڑوں گا

عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا
توڑ ڈالوں گا میں زنجیر اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

• باغی

-O-

کچھ سُننے کی خواہش کانوں میں ، کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنّا بانہوں میں
مشتاق نگاہوں کی زد سے نظروں کا حیا سے جھک جانا
اک شوق ہم آغوشی پنہاں ، ان نیچی بھیگی پلکوں میں
شانے پہ پریشاں ہونے کو بے چین سیہ کا کل کی گھٹا
پیشانی میں طوفاں سجدوں کا ' لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں

• لمحۂ رخصت

-O-

بیدار ہوئیں مہر جوانی کی شعاعیں
پڑنے لگیں عالم کی اسی سمت نگاہیں
خوابیدہ تھے جذبات بدلنے لگے کروٹ
روئے شرر طور سے ہٹنے لگا گھونگٹ
بھرنے لگے بازو تو ہوئے بند قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ

• جوانی (5)

دراصل یہ جوشؔ سے اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ واقعاتِ خارجی ہوں کہ معاملات حسن وعشق' جب مخدوم انھیں اپنی روح کی گہرائیوں سے محسوس کرنے لگے تو جوشؔ کے اسلوب سے دامن چھڑانے لگے۔ خود سرخ سویرا ہی سے اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ان کی نظموں انتظار، انقلاب، مسافر اور تارے وغیرہ کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔ جن میں خارجی احساس اور بلند آہنگی کم محسوس کی جا سکتی ہے:۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
نظریں نیچے کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پہ بکھرائے ہوئے آئے گا
پتّیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

• انتظار۔(6)

بات یہ ہے کہ حسن اور حقیقت کے تئیں مخدوم کا روّیہ جوں جوں داخلی ہوتا گیا، خارجی احساس اور بلند آہنگی سے دامن چھڑانے کا عمل بھی تیز تر ہوتا گیا۔ توں توں ان کا لہجہ نرم اور اسلوب مجازی وتمثیلی ہوتا گیا۔ تخلیقات میں وضاحت کی جگہ ابہام اور حقیقت کی جگہ مجاز کو فروغ حاصل ہوتا گیا۔ اس کی ایک وجہ واردات عشق کا بیان بھی ہے۔ یہ طے ہے کہ مخدوم کا شعری مزاج حسن وعشق کی سرشاریوں سے ہم آہنگ رہا ہے۔ اپنے پہلے مجموعۂ کلام سرخ

سویرا سے لے کر آخری مجموعۂ کلام بساطِ رقص تک یہ رنگ و آہنگ ان کے مزاج میں باقی رہا۔ البتہ اس کی کیفیت و کمیت عہد بہ عہد بدلتی رہی۔ مثلاً گل تر میں حسن کی رعنائی، جمال بدن کی شگفتگی اور عشق کی شیفتگی کا احساس جس طرح پایا جاتا ہے وہ سرخ سویرا کی عشقیہ نظموں میں مفقود ہے۔ خصوصاً گل تر کی غزلیں عشق کے سرور اور بدن کے جمال کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہیں۔

البتہ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ مخدوم کی وہ دور اوّل کی خارجی احساس و بلند آہنگ والی تخلیقات ہوں کہ وہ بعد کے دور کی داخلی احساس و نرم آہنگ والی نظمیں و غزلیں، ہر دو طرح کی تخلیقات میں محبوب اور محبت کے لیے آواز اور روشنی کے پیکروں اور استعاروں کی کثرت پائی جاتی ہے۔ پہلے کچھ مثالیں سرخ سویرا سے ملاحظہ فرمائیے۔

1۔ وہ کیا آیا، رنگیلی راگنی، رنگیں رباب آیا
مجھے رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب آیا
فضا میں منتشر رنگیں بدن کی لرزشیں ہوتیں
رباب دل کے تاروں میں مسلسل جنبشیں ہوتیں

• طور

2۔ اڑ رہا ہے غبار نورِ بدن
پھیلتی جارہی ہے بوئے بدن
موج تسنیم و کیف و خلد بریں
جگمگاتا بدن، چمکتی جبیں
وہ کہ رنگیں کرن تبسّم کی

اک مسلسل لڑی ترنّم کی
پردہ تن میں راگ پوشیدہ
راگ وہ، آگ جس میں پوشیدہ

• سجدہ

یہ چند مثالیں سرخ سویرا سے بلا تکلف اُٹھالی گئی ہیں۔ اب ذرا داخلی احساس و نرم آہنگ والی تخلیقات سے چند ایک مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

1۔ اندھیرے کے پردے ہلے
کئی نور کی انگلیاں جگمگائیں
شفق در شفق رنگ در رنگ
عارض کا حیرت کدہ سامنے ہے
وہ ہنستا ہوا مے کدہ سامنے ہے

• بلّور (1964ء)

2۔ آج چھٹکی ہے رخسار کی چاندنی
چھٹ گئی بدلیاں، کھل گئے پیچ و خم

• غزل

3۔ منور خموشی کے بلّور چمکے
کرن مرمریں فرش پر چھن سے ٹوٹیں
کلی چٹکی، آواز کے پھول مہکے
رنگوں کی، سروں کی، کوئی کہکشاں

کھلکھلاتی ہوئی گود میں آ پڑی

• بلّور۔(7)

4۔ یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے
جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے

• غزل(1959ء) (8)

5۔ جام میں تیرے ماتھے کا سایہ گرا
گھل گیا
چاندنی گھل گئی

• خواہشیں۔(9)

محبوب کے لیے روئے شرر طور، غبار نورِ بدن، رنگیلی راگنی، رنگیں رباب، ترنم کی لڑی، رنگیں کرن جیسے استعاراتی پیکر کا استعمال، محبوب کی روانی کو گھنگروؤں کی آواز سے تو محبوب کے بدن کو راگ سے اور وہ بھی ایسے راگ سے جس میں آگ دبی ہوئی ہو، تعبیر کرنا، محبوب کے عارض کو ہنستا ہوا مے کدہ تو اس کے جمال کو حیرت کدہ قرار دینا، نور کی انگلیوں والا محبوب، اپنے جلو میں چاندنی راتیں لیا ہوا محبوب .....محبوب اور محبت کے لیے آواز اور روشنی کے پیکروں کی یہ کثرت، مخدوم کے تجربے اور بیان کو نور سے بھر دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ راگ اور روشنی، دونوں بنفسہٖ لطیف ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ پیکر کسی مادی تصور یا مادی حقیقت سے جڑ جائیں تو اسے بھی لطیف و منزّہ بنا دیتے ہیں۔ اور جب مخدوم نے محبوب اور محبت کو ان پیکروں و استعاروں کے حوالے بیان کیا تو ان کا تجربہ و بیان دونوں نور سے معمور ہوئے۔ محبوب ہو کہ محبت دونوں کو ایک پاکیزگی و تقدیس نصیب ہوئی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ مخدوم کے ہاں عشق، کوئی افلاطونی عشق ہے۔ یہ تو ایک مکمل بھرپور جبلی جذبہ اور ایک

خالص بدنی ضرورت سے عبارت ہے لیکن ''خدا بھی مسکرا دیتا تھا، جب ہم پیار کرتے تھے'' (طور، سرخ سویرا)، دو بدن / اوس میں بھیگتے / چاندنی میں نہاتے ہوئے / پیار کی آگ میں جل گئے (چارہ گر، گل تر) اور پیار کی رات کی آنکھ میں اُمڈ آتی ہے / اور دو پھول / تنور بدن / شبنم پی کر سو جاتے ہیں (وصال، بساط رقص) جیسے استعاراتی پیکر، محبوب کے بدن کے جمال کا ذکر ہو کہ وصال یار کا بیان، دونوں کو منزّہ منور بنا دیتے ہیں۔

مخدوم کا محبوب، منوّر و منزّہ ہی نہیں مشفق و مہربان بھی ہے۔ ان تخلیقات کے متکلم کو اس کے پیار میں ایک سکون ملتا ہے۔ اس کی لطیف انگلیاں عاشق کے درد کو چوس لیتی ہیں۔ اس کی ہتھیلیوں کی نرمیاں شراب کے جام میں تحلیل ہو کر عاشق کی روح و جان میں اتر جاتی ہیں۔ اس کی امرت بھری انگلیوں سے دل کو آرام اور پھپھولوں کو سکون ملتا ہے۔ مخدوم کی زبان سے آپ خود سنیے:۔

1۔ جز تری آنکھوں کے کن آنکھوں نے
لطف کا ہاتھ رکھا درد کی پیشانی پر
پیار کی آنکھوں سے آنسو پونچھے

2۔ نرمیاں
لمحۂ وصل کی مانند
دل و جاں میں اترتی ہی چلی جاتی ہیں .....
جز تری آنکھوں کے۔(10)

3۔ زخم کے ماتھے سے امرت بھری انگلی نہ ہٹاؤ
دل کو آرام ، پھپھولوں کو سکون ملتا ہے

وقت بے درد مسیحا ہے۔ (11)

4۔ دل بڑھاتی ہیں ہاتھ کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے
5۔ قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے دم شعلہ ساز ساتھ رہے
6۔ تمام عمر چلی ہے، تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یارِ غم گسار کی بات (12)

غرض مخدوم کا محبوب، معشوق ہی نہیں یارِ غم گسار بھی ہے۔ وہ محبّ ہی نہیں مشفق بھی ہے۔ کثیف ہی نہیں لطیف بھی ہے۔ وہ سراپا بدن ہی نہیں مہربان بھی ہے۔ مخدوم نے اردو شاعری کو کچھ اور دیا ہو کہ نہ دیا ہو، محبوب کا ایک نیا پیکر تو دیا ہے۔ ایسا محبوب جو اپنے جمال کی رعنائی، وصال کی سرور انگیزی کے باوجود منوّر و منزّہ اور مشفق و غم گسار بھی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ مکتبہء صبا کے گلِ تر کے ایڈیشن میں ہر تخلیق کے نیچے سنہ تصنیف درج ہے۔ ان تواریخ کے تناظر میں مخدوم کی تخلیقات کا مطالعہ معنویت اور کیفیت کا ایک نیا باب ہم پروا کرتا ہے۔ شاید ہی کسی فن کار کی تحریریں اس قدر اس کی زندگی کا آئینہ ہوسکتی ہیں جس قدر مخدوم کی تخلیقات ہیں۔ گلِ تر کی تخلیقات کے عہد واری مطالعے کے ذریعے نہ صرف مخدوم کے بدلتے ہوئے اسلوب وافکار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے بلکہ ان کے وارداتِ عشق کا مشاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ یوں تو مخدوم کی تخلیقات میں عشق کی شیفتگی، حسن کی رعنائی اور جمالِ بدن کی شگفتگی کا احساس ان کی نظم ''چارہ گر'' (1956ء) ہی سے شروع ہو چکا تھا جو سرخ سویرا والے حسن وعشق کے بیانات سے بالکل مختلف ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی تو یہ

ہوئی کہ مخدوم ''آج کی رات نہ جا'' (1956ء)، ''بھاگ متی'' (1958ء)، ''چاند تاروں کا بن'' (1958ء) اور نظم ''رقص'' (1958ء) سے گزر کر جب 1959ء میں پہنچے تو غزل گوئی کو اختیار کیا۔ اور لگا تار تین سال تک غزلیں لکھیں۔ گلِ تر میں کل 17 نظمیں اور 16 غزلیں شامل ہیں۔ سوال یہی تو ہے کہ ایک مزاجاً نظم گو شاعر کا غزل گوئی کو اختیار کرنا، کیا جواز رکھتا ہے۔ عالم خوندمیری نے مخدوم کا غزل گوئی کو اختیار کرنے کو ایک لاشعوری عمل بتایا ہے:

''مجھے یقین ہے مخدوم نے غزل کو شعوری طور پر نہیں بلکہ لاشعوری طور پر اپنایا ہے۔ نظم سے غزل کی جانب ان کا سفر ایک شاعرانہ مزاج کی تبدیلی کا ایک ناگزیر نتیجہ نظر آتا ہے۔ شاعر کو جس نئی آزادی کی ضرورت تھی وہ غزل میں اس کو حاصل ہوئی۔'' (13)

''غزل کی جانب رجحان ایک حادثہ اتفاقی نہیں لیکن ایک اتفاقی حادثے نے شاید اس رجحان کو تیز تر کر دیا۔'' (14)

عالم خوندمیری صاحب نے غزل گوئی سے مخدوم کے رجوع ہونے کو ایک اندرونی ضرورت یعنی ایک نئی آزادی کی ضرورت اور ایک اتفاقی حادثے کو قرار دیا ہے۔ اور وہ اتفاقی حادثہ مخدوم کا عشق ہے۔ خوندمیری صاحب کی یہ تعبیر اس لیے بھی صحیح لگتی ہے کہ گلِ تر کی تقریباً تخلیقات، صرف دو چار مسائلی نظموں کو چھوڑ کے، وہ نظمیں ہوں کہ غزلیں، عشق کے جذبے سے سرشار نظر آتی ہیں۔ ادب کی تاریخ میں یہ غزلیں شاید کوئی زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوں لیکن مخدوم کے نجی حوالے کی حیثیت سے بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ غزل جو مزاجاً ایک داخلی صنفِ سخن ہے اور حسن کی بوقلمونی اور عشق کی تلون مزاجی کے بیان کے لیے موزوں ترین

صنف سخن ہے۔ لہٰذا ایک نظم گو شاعر کا غزل کو اختیار کرنا گویا داخلیت کو مکمل طور سے اختیار کرنے کا اعلامیہ ہے۔ دراصل مخدوم نے واردات حسن و عشق کے بیان کے لیے نظم کے تفصیلی اسلوب کے مقابلے میں غزل کی اجمالی و ایمائی پیرایئے اور مجازی اسلوب کو اختیار کرنے کو احسن جانا۔ اگرچہ غزل میں واردات حسن و عشق کا بیان کوئی نیا نہیں لیکن مخدوم کی غزلوں میں عشق کی وارفتگی، حسن کی روشنی، جمال بدن کی شگفتگی، وصال کی سرشاری اور فراق کی سرور انگیزی جس طرح پائی جاتی ہے وہ اردو غزل کی روایت میں کم ہی نظر آتی ہے۔

1۔ بے صحبت رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی ' مے وہی ' مے خانہ وہی ہے
1959ء

2۔ ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری ' یاد کے پھولوں میں بسی ہے
1959ء

3۔ شمیم پیرہن یار ' کیا نثار کریں
تجھی کو دل سے لگائیں ' تجھی سے پیار کریں
1959ء

4۔ رت پلٹ آئے گی اک آپ کے آ جانے سے
کتنے افسانے ہیں ' سننے ہیں جو دیوانوں سے
1959ء

5۔ دلوں کی تشنگی جتنی ' دلوں کا غم جتنا

اسی قدر ہے زمانے میں حسن یار کی بات
1959ء

6۔ اور بھی بیٹھے ہیں اے دل ، ذرا آہستہ دھڑک
بزم ہے ' پہلو بہ پہلو ہے ' کلام آہستہ
1959ء (15)

1959ء تک کی غزلیں جمالِ یار سے روشن' وصال یار سے سرشار حتٰی کہ فراق کے لمحات بھی وصال کے لمحوں کی طرح شاداب و شگفتہ پائے گئے۔ شگفتگی اس یقین کی وجہ سے ہے جو انھیں اپنے محبوب پر ہے اور سرشاری وصال کی یادوں کے سبب سے ہے۔ سرشاری کا یہ عالم ہے کہ ویرانی معمور نظر آتی ہے تو کوہ والم ہیچ۔ ہوائیں مہکتی ہوئیں' خاموشیاں چہکتی ہوئیں نظر آتی ہیں تو منزلیں غبار کی مانند اُڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

وہ عطر تری کا کل شب رنگ نے چھڑکا
مہکی ہے خرد ' روح کلی بن کے کھلی ہے
1959ء

نکہت یار سے آباد ہے ہر کنج قفس
مل کے آئی ہے صبا ، اس گل تر سے پہلے
1959ء

یہ کوہ کیا ہے ، یہ دشت الم فضا کیا ہے
جو اک تری نگہہ دل نواز ساتھ رہے
1959ء

یہ تمنّا ہے کہ اُڑتی ہوئی منزل کا غبار
صبح کے پردے میں یا آ گئی شام آہستہ

1959ء(16)

لیکن آہستہ آہستہ یادوں پر سے یقین اُٹھنے لگا۔ دیدوں کے افق پر جمال یار کی شفق کی جگہ نمی سی نظر آنے لگی۔ وصل کی سرشاری کی جگہ حسرتیں مچلتی نظر آنے لگیں۔ دل کے سفر میں محبوب کا قرب نہیں، اس کی یاد ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ کل تک خموشی جو نغمہ ریز ہوا کرتی تھی اب صداؤں میں خاموشی سنائی دینے لگی۔

1۔ اب کہاں جا کے یہ سمجھائیں کہ کیا ہوتا ہے
ایک آنسو جو سرِچشم وفا ہوتا ہے
دل کے محراب میں اک شمع جلی تھی سرِ شام
صبح دم ماتم ارباب وفا ہوتا ہے

1959ء

2۔ کھٹکھٹا جاتا ہے ' زنجیرِ دَر مے خانہ
کوئی دیوانہ ' کوئی آبلہ پا ' آخر شب

1960ء

3۔ فصل گل ہوتی تھی کیا ' جشنِ جنوں ہوتا تھا
آج کچھ بھی نہیں ہوتا ہے گلستانوں میں

1960ء

4۔ تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے
شاخ گل کھوئی ہوئی ' مرغ خوش الحاں چپ ہے

1960ء (17)

وقت کے ساتھ ویرانی اور خاموشی کا احساس اور بڑھ جاتا ہے۔ آنکھوں کے معمورے میں خوابوں کی لپک نہیں ویرانی کی دھول اڑتی نظر آتی ہے۔ رات جو کل سرشاری کا پیام لیے ،جلو میں چاندنی کا اہتمام کیے آتی تھی، اب سناٹے لیے آنے لگی۔ تنہائی روح و جان اور رگ و پے ہی میں نہیں گلیوں' کوچوں اور شہروں میں تک در آئی ہے' دل انگارہ محسوس ہوتا ہے:

1۔ عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کے کچھ رات کٹے
کوئی جلتا ہی نہیں ' کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

1960ء(18)

کیسی طے ہوتی یہ منزل شام
کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم
ایک ہتھیلی میں دل ' اک ہتھیلی میں جاں
اب کہاں کا یہ سودوزیاں دوستوں

1961ء کے بعد کی۔(19)

اڑ نہ جائے کہیں یہ رنگِ جبیں
مٹ نہ جائے کہیں یہ نقش وفا
چپ نہ ہو جائے یہ بجتا ہوا ساز
شمعیں اب کون جلائے گا' سرِ شام گزرگاہوں میں
دہر میں لطف وعطا کچھ بھی نہیں

دہر میں مہر و وفا کچھ بھی نہیں
سجدہ کچھ بھی نہیں نقش کفِ پا کچھ بھی نہیں (20)

حیدرآباد والوں میں سے کسی اور نے مخدوم کی اس بے محابا تنہائی کو پہچانا ہو کہ نہ پہچانا ہو، دو لوگوں نے تاڑ لیا تھا۔ ایک زینت ساجدہ اور دوسرے عالم خوندمیری۔ زینت ساجدہ لکھتی ہیں:

''مگر معلوم نہیں ہنسنے بولنے کھلکھلانے والا مخدوم شعر سناتا ہے تو وہ مجھے بالکل تنہا نظر آتا ہے۔ تنہا مسافر، شب گزیدہ، جو اپنے دل کا چراغ جلائے، سب کے لیے راہ روشن کر رہا ہے۔'' (21)

زینت ساجدہ نے جب مخدوم کی تنہائی کو تاڑ لیا تھا تو یقیناً اس تنہائی کی وجہ تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ لیکن انھوں نے اسے بتانے سے گریز کیا ہے۔ البتہ عالم خوندمیری صاحب نے مخدوم کی تنہائی کے حوالوں تک رسائی حاصل کی اور ہمیں بھی ان سے روشناس کرایا۔ بلکہ انھوں نے مخدوم کی غزل گوئی کی وجہ بھی اسی تنہائی کو قرار دیا:

''تنہائی اور اجنبیت کا دردناک احساس مخدوم کی غزلوں میں بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔'' (22)

''تنہائی، سوگواری، ماحول سے بیزارگی، خستگی اور پھر ان تمام چیزوں کے اظہار میں ایک تامل اور تکلّف ... ان حالات میں شاعر کے غزل کے دامن میں پناہ لینے کو ایک حادثۂ اتفاقی نہیں کہا جا سکتا۔'' (23)

عالم خوندمیری صاحب نے اس تنہائی، سوگواری اور خستگی کو مخدوم کے لیے ایک نعمت،

ایک درد کی سوغات قرار دیا ہے۔ اس سوغات کا سبب ماحول سے اجنبیت کو قرار دیا ہے۔ مخدوم کی نظم چارہ گر کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اس نظم میں شک نہیں یقین ہے اور اس یقین سے پیدا ہونے والا غم ہے کہ انسانی گتھیوں کو سلجھایا نہیں جا سکتا۔ کوئی ماحول ایسا نہیں ہو سکتا جس میں انسان، کائنات اور سماج میں اجنبیت کے احساس سے نجات حاصل کر سکے۔ انسان اور کائنات، انسان اور انسان اور انسان اور سماج کا تصادم، چند ایسے واقعات ہیں، جو انسانی زندگی سے وابستہ ہیں۔ صرف محبت کے مختصر لمحات میں ایک نسبتاً حقیقی ربط قائم ہو سکتا ہے۔ انسانی جسم اور جسموں کے اتحاد ہی سے انسان اور کائنات کا اور انسان اور انسان میں ربط قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن دوسرے نامعقول رشتے، جن کی نمائندگی مندر، مسجد اور سماج کرتے ہیں، اس ربط کے دشمن ہیں۔'' (24)

عالم خوندمیری صاحب نے دو جسموں کے اتحاد میں پیدا ہونے والی اجنبیت کو طبقاتی نظام اور عقیدوں کی تفریق (جس کے نمائندے مسجد اور مندر ہیں) کو قرار دیا ہے۔ لیکن میرا تو احساس ہے کہ مخدوم نے نظم چارہ گر میں ''مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں، مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں'' لکھا ہے نہ کہ مسجد کے مناروں اور مندر کے کواڑوں، نے روکا انھیں۔'' اس پر گفتگو آگے ہوگی۔ البتہ اکثر سوچا کرتا ہوں کہ شاعر نے ''پیار حرف وفا، پیار ان کا خدا'' جیسے مصرعوں کے ساتھ ''پیار ان کی چتا'' جیسا بے جوڑ مصرع کیوں لکھا۔ ایک رعایت ''پیار کی آگ میں جلنے'' کی پائی جاتی ہے۔ یا پھر شاعر کو لاشعوری طور پر احساس ہو چکا تھا کہ

جو پیار ان کے لیے خدا ہے، وہی ان کے پیار کی چتا بھی ثابت ہوگا۔

خیر۔ وجہ سماجی ہو کہ طبقاتی یا لاشعوری ہو۔ البتہ یہ طے ہے کہ محبت نے مخدوم کو تنہا کیا ہے۔

مخدوم کی شاعری دراصل عشق میں تنہا پڑ جانے والے انسان کی بپتا ہے۔ عشق نے انھیں شیفتگی و شگفتگی بخشی تھی، عشق ہی نے ان سے شگفتگی چھین لی۔ محبت نے انھیں سرشار کیا تھا' محبت ہی نے انھیں بے کیف بھی کیا ہے۔ محبت ہی نے انھیں انتظار کی لذّت عطا کی تھی، محبت ہی نے انھیں سراپا انتظار بھی کیا ہے۔ محبت نے ان کی آنکھوں سے آنسو پونچھے تھے، محبت ہی نے ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دیے بھی جلائے۔ عشق نے انھیں معمور کیا تھا عشق ہی نے انھیں ویران بھی کیا۔ اور ویرانی بخشی بھی تو ایسی کہ انھیں ہر بزم میں خاموشی، ہر آواز میں سناٹا اور ہر گھر میں تنہائی نظر آنے لگی۔

کوئی دھڑکن

نہ کوئی چاپ

نہ سنچل

نہ کوئی موج

نہ ہلچل نہ کسی سانس کی گرمی

نہ بدن

.....

ایسے سنّاٹے میں اک آدھ تو پتّہ کھڑکے

کوئی پگھلا ہوا موتی

کوئی آنسو

کوئی دل

کچھ بھی نہیں

کتنی سنسان ہے یہ راہ گزر

کوئی رخسار تو چمکے

کوئی بجلی تو گرے

سنّاٹا (1961ء) (25)

رات ہی رات ہے' سنّاٹا ہی سنّاٹا ہے

کوئی ساحل بھی نہیں

کوئی کنارہ بھی نہیں

کوئی جگنو بھی نہیں

کوئی ستارہ بھی نہیں

وادیِ فردا ۔(26)

1961ء کی اور اس کے بعد کی تخلیقات پر نظر ڈالیں تو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ صرف اسلوب اور مضامین ہی نہیں' صنف کے انتخاب میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ یعنی 1961ء کے بعد سے مخدوم کی دل چسپی غزل سے کم ہوتی گئی۔ بساطِ رقص اور اس کے بعد کی تخلیقات میں صرف پانچ غزلیں ملتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ غزل تو جانِ غزل کے لیے کہی جا رہی تھی، جب جانِ غزل ہی نہ رہی تو غزل کہنے کی اِچھا Urge کہاں رہ جاتی ہے۔

بساط رقص تک آتے آتے مخدوم کے کلام میں رات بڑی سنگین ہو جاتی ہے۔ سرخ

سویرا میں رات، ظلم، جبر اور شدائد کا استعارہ یعنی ترقی پسندوں کا استعارہ تھی تو گل تر میں وہی رات سرور و شگفتگی اور وصال و جمال کا استعارہ۔ لیکن بساطِ رقص میں وہی رات، تنہائی، ویرانی، سفاکی و سنگینی کی علامت بن جاتی ہے۔ ان کے آخری دور کی شاعری میں تنہائی و ویرانی کا جو شدید احساس ملتا ہے، نہ تو وہ کسی ادبی فیشن کے تطبع کا نتیجہ ہے نہ کسی مغربی فلسفے کے مطالعے کی دین نہ کسی اقدار کے اجڑنے کا صلہ ہے نہ کسی بیرونی جبر کا نتیجہ۔ یہ تنہائی تو عشق کی عطا کردہ سوغات ہے۔ اگرچہ انھوں نے رات کی سفاکی کو بھلانے اور دل کی تنہائی کو دور کرنے کے لیے جام و مینا اور وصال کی یادوں کا سہارا بھی لیا تھا۔ خود کو دن کے ہنگام میں غرق بھی کر رکھا تھا، لیکن یہ سارے بھرم رات کے آتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔

یہ رات
درد کی کاہکشاں ہے کہ صلیبوں کی برات
رات، اک ساقیِ بے فیض کی مانند گزرتی ہے
گزر جانے دو
وقت!
او مشفق و محسن قاتل
رات کی نبض میں نشتر رکھ دے
رات کا خون ہے
بہہ جاتا ہے
بہہ جانے دو

وقت: بے درد مسیحا (27)

یہ شہر اپنا
عجب شہر ہے کہ
راتوں میں سڑک پر چلیے تو
سرگوشیاں سی کرتا ہے
وہ لا کے زخم دکھاتا ہے
راز دل کی طرح
دریچے بند،
گلی چپ،
نڈھال دیواریں
کواڑ مہر بلب

اپنا شہر (28)

کہیں شہر، شاعر کا استعارہ تو نہیں کہ وہ اپنے زخم نظموں کی صورت میں دکھا رہا ہے۔ لیکن دیکھنے والا کوئی نہیں۔ کہ دریچے بند ہیں، دیواریں نڈھال ہیں اور کواڑ مہر بلب۔ جب ایسی جاں کاہ ویرانی ہو، جب ایسی بے محابا تنہائی ہو، تو انسان کو ماں کی یاد آتی ہے۔

تو چاروں نے دیکھا کہ
وہ چاند تنہا ہے
اک درد سب کے دلوں میں پگھلنے لگا
ان کی نظروں نے بوسے لیے چاند کے
چاند کی پیٹھ کو تھپتھپایا

بڑے پیار سے، بڑے درد سے

.....

جوش و مستی کے عالم میں
شیشے میں جتنی بچی تھی
وہ سب بانٹ کر
قہقہے مار کر پی گئے
اور گلے ملے کے اک دوسرے کو بہت دیر تک چومتے بھی رہے
قہقہے مارتے مارتے
ناچتے ناچتے
چاروں رونے لگے
ہر ایک کے منہ سے نکلا
''یارو! ماں یاد آتی ہے جاتا ہوں میں''

رات کے بارہ بجے (29)

آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ان چار بدمستوں کو ماں کی یاد کیوں آئی ؟ اگر آپ ان مصرعوں پر غور کریں ''وہ چاند تنہا ہے / اک درد سب کے دلوں میں پگھلنے لگا'' تو محسوس ہوگا کہ سارے سنسان شہر میں چاند کی تنہائی کو محسوس کرنے والے یہ چاروں ہی تو ہیں۔ موزہ کیا جانے پانو کا گھاؤ۔ دراصل یہ چاروں بھی، چاند کی طرح تنہا ہیں۔ سوانھوں نے چاند کے دکھ کو سمجھا۔ لیکن ان کی تنہائی چاند کی تنہائی سے زیادہ سخت اور اذیت ناک اس لیے ہے کہ یہ چار ہوتے ہوئے بھی تنہا ہیں۔ ایسے میں ماں کا یاد آنا فطری ہے۔

ہر ایک کے منہ سے نکلا

یارو!
ماں یاد آتی ہے جاتا ہوں میں
میں نے تورات وانجیل وقرآن میں
برمیہ، ہاجرہ اور یعقوب
کے کرب کی داستانیں پڑھی ہیں
ان کا رونا سنا ہے
اور رویا بھی ہوں
آج بھی رو رہا ہوں

رات کے بارہ بجے (30)

چاروں کے منہ سے ان ہی جملوں کا نکلنا، یا چاروں ہم آواز ہو کے کہنا ..... ایک آواز میں کہنا ..... کہیں چاروں ایک ہی تو نہیں ہیں' بظاہر چار ہوں، لیکن ان سب کا دکھ ایک، وہ سب ایک ہیں، وہ سب ایک ہیں، یعنی دکھ کا کنایہ۔

لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ایک ایسے شاعر کو جس نے اپنی عمر کی 58 سے زیادہ منزلیں طے کر لی ہوں' اسے اپنی ماں کا یاد آنا کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر اس نظم کے ساتھ مخدوم کے آخری دور کی ایک اور نظم ''لخت جگر'' کو بھی شامل کر لیں، تو یہ دونوں تخلیقات مخدوم کی ساری شاعری اور ان کی لفظیات، ان کے پیکروں اور استعاروں پر از سر نو غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں:

محبت کو تم لاکھ پھینک آؤ، گہرے کنوئیں میں
مگر ایک آواز پیچھا کرے گی

کبھی چاندنی رات کا گیت بن کے
کبھی گھپ اندھیرے کی پگلی ہنسی بن کے
پیچھا کرے گی
وہ آواز
ناخواستہ طفلک بے پدر
ایک دن سولیوں کے سہارے
بنی نوع انساں کی ہادی بنی
پھر خدا بن گئی
.....
کوئی ماں
کئی سال پہلے
زمانے کے ڈر سے
سر رہ گذر
اپنا لختِ جگر چھوڑ آئی
وہ طفلک ناخواستہ
.....

لختِ جگر (31)

ماں کا یاد آنا، طفلک بے پدر، کئی سال پہلے ماں کا اپنا لختِ جگر کو چھوڑ آنا جیسے پیکر.....
واقعہ یہ ہے کہ مخدوم محی الدین، پانچ سال کی عمر ہی سے اپنے والدین کے سایۂ عاطفت سے

محروم ہو گئے تھے۔ مغنی تبسم نے مخدوم کے سوانح بیان کرتے ہوئے محض اتنا لکھا:

''والد کے وفات کے وقت مخدوم کی عمر پانچ برس دو ماہ تھی۔ چچا بشیر الدین نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ والدہ کے بارے میں مخدوم کو کچھ نہیں بتایا گیا۔''(33)

گویا مخدوم کی ماں کے متعلق کچھ اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ البتہ راج بہادر گوڑ صاحب نے مخدوم کی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا:

''مخدوم اس وقت یتیم ہو گئے، جب ان کی عمر صرف چار سال تھی۔ ان کی والدہ نے ان کے والد کے انتقال کے بعد عقد ثانی کر لیا۔ اور ایک طویل عرصے تک مخدوم اس بات سے واقف نہیں تھے کہ ان کی والدہ بقید حیات ہیں۔ اور جب انھیں اس بات کا پتہ چلا تو وہ ان سے ملنے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ لیکن یہ ملاقات اس وقت ممکن ہو سکی جب وہ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لینے کے لیے حیدرآباد آئے۔ مخدوم کی پرورش ان کے چچا مرحوم بشیر الدین نے کی۔''(34)

راج بہادر گوڑ کے بیان کردہ سنہ پیدائش اور ان کے بیان والدہ نے عقد ثانی کر لیا، سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود' یہ تسلیم کہ جوانی میں داخل ہونے تک مخدوم اپنے ماں باپ، خصوصاً اپنی ماں کے پیار سے محروم رہے۔ ماں کے پیار سے محرومی کا احساس اس وقت اور بھی بڑھ جاتا ہے، جب کسی بچے کو معلوم ہو جائے کہ اس کی ماں زندہ ہے اور اس سے دور۔ ان بدلے ہوئے حالات میں، مخدوم اور ان کی ماں کے درمیان کس طرح کے روابط رہے ہیں، مخدوم کے سوانح نگاروں نے اس پر تفصیل سے لکھنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس تناظر میں نظم

''لختِ جگر'' بلیغ و معنی خیز ہو جاتی ہے۔ بلکہ ایک تمثیلی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماں کے پیار سے محروم لڑکے کو، زندگی کے کسی بھی موڑ پر ماں یاد آ سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب انسان ہر طرح سے کمزور ہو جاتا ہے اور ہر طرف سے بے سہارا ہو جاتا ہے تو اسے دو سہارے یاد آتے ہیں: ایک خدا کا، دوسرا ماں کا۔ اس نظم میں ''برمیہ' ہاجرہ اور یعقوب کی تلمیح الٹ گئی ہے۔ ہاجرہ اور یعقوب بالترتیب ایک اپنی اولاد کے لیے بے چین و کرب میں مبتلا دوڑتی رہیں تو دوسرے نے اولاد کے غم میں آنکھیں تک گنوالیں۔ لیکن نظم کا متکلم اپنی ماں کے غم کو سینے میں دبائے جی رہا ہے۔ کرب و بلا میں مبتلا ہے۔ مخدوم کی شاعری میں پنہاں اشاروں کی مدد سے یہ رائے قائم کرنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ ماں کی شفقت اور پیار سے محروم لڑکے نے اپنے محبوب کے پیکر میں شفقت مادر سے محرومی کی تلافی کرنی چاہی۔ ان کی شاعری میں محبوب کا بے حد شفیق اور غم گسار ہونا بھی دراصل اس طفلک بے پدر کی بے مادری کے احساس کا نتیجہ ہے۔ یعنی ان کے لاشعور نے محبوب کی شفقت اور غم گساری میں اپنی بے مادری کے احساس کی تلافی کرنی چاہی۔ مخدوم کا عشق تقدس اور جبلت، دونوں کے امتزاج اور ترکیب سے عبارت ہے۔ یہ مرکب احساس مخدوم کی ابتدائی شاعری تا آخری دور کی شاعری تک میں پایا جاتا ہے۔ بہت سی مثالیں ہم نے محبوب کے مشفق ہونے کے باب میں دی ہیں، ایک آدھ مثال اور لکھ دیتے ہیں:

میری آنکھوں کے پیکر میں وہ گھل جاتی ہے کیف نظر بن کر
مجھے قوس قزح کی چھاؤں میں وہ پہروں سلاتی ہے
سحر تک وہ مجھے چمٹائے رکھتی ہے کلیجے سے
دبے پاؤں کرن خورشید کی آگے جگاتی ہے

نیند (سرخ سویرا)

ان مصرعوں میں شاعر نے اگرچہ نیند کی کیفیت بیان کی ہے لیکن مادرانہ پیکروں کی مدد سے۔

جز تری آنکھوں کے کن آنکھوں نے
لطف کا ہاتھ رکھا درد کی پیشانی پر
پیار کی آنکھوں سے آنسو پونچھے

جز تری آنکھوں نے۔ (گل تر)

غرض ان دو متضاد و متخالف جذبوں کی وحدت کے سبب ان کا محبوب ایک پیچیدہ پیکر کا حامل ہے۔ وہ بیک وقت محبوب بھی ہے اور لاشعوری سطح پر مادرانہ حیثیت کا حامل بھی۔ مخدوم نے ان دو متضاد معنویتوں کو ایک پیچیدہ استعاراتی پیکر یعنی 'مادر محبوب' (Mother Beloved) کے روپ میں محسوس کیا ہے اور اسے نور و آواز کے پیکروں کی مدد سے پیش کیا ہے۔ وہ محبوب بھی ہے اور ماں کی طرح شفیق بھی۔ ان ہی متضاد و متخالف جذبوں کی یک جائی اور آواز و نور کے پیکروں کے سبب ان کی محبت اور ان کے عشقیہ معاملات پر ایک تقدس کا پردہ پڑا ہوا نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی عاشقی پاکیزہ اور منزّہ محسوس ہوتی ہے۔ وہ ان کی ابتدائی دور کی شاعری ہو کہ آخری دور کی شاعری، ہر دو میں یہ بات صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔

1۔ خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
بلائے فکرِ فردا ہم سے کوسوں دور ہوتی تھی
سرور سرمدی سے زندگی معمور ہوتی تھی

ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی

طور (سرخ سویرا)

2۔ میرے محبوب مری نیند اڑانے والے
میری مسجود ، مری روح پہ چھانے والے
آ بھی جاتا کہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جاتا کہ ترے قدموں پہ مری جاں نکلے

انتظار (سرخ سویرا)

3۔ دو بدن اوس میں بھیگتے
چاندنی میں نہاتے ہوئے
مسجدوں کے مناروں نے دیکھا انھیں
مندروں کے کواڑوں نے دیکھا انھیں
دو بدن پیار کی گ میں جل گئے
پیار حرف وفا
پیار ان خدا
پیار ان کی چتا......

چارہ گر (گل تر)

4۔ گھونگٹ ،مکھڑے ،جھومر ، پائل
چمک دمک جھنکار امر ہے
پیار امر ہے

پیار کی رات کی آنکھ امڈ آتی ہے
اور دو پھول
تنور بدن
شبنم پی کر سو جاتے ہیں

وصال (بساط رقص)

پیار اور وصال کے لیے شبنم پی کر سو جانے سے یا اوس میں بھیگنے ، چاندنی میں نہاتے ہوے بدنوں کے جل جانے سے استعارہ کرنا ، مسجدوں کے مناروں اور مندروں کے کواڑوں کو وصال کا گواہ ٹھہرانا ، پیار کو خدا قرار دینا ،معصوموں کو پیار کرتے ہوئے دیکھ کر خدا کو مسکراتے ہوئے بتانا ،معصوم خلوت کو رشک طور ٹھہرانا ، پیار کے لمحات کو سرور سرمدی سے معمور جاننا ،محبوب کو مسجود جاننا ،محبوب کے قدموں پر جان دینے کا ارمان رکھنا...... دراصل ان پیکروں اور استعاروں کے ذریعے وہ دو مختلف و متضاد جذبوں (یعنی جنس اور مادرانہ شفقت) کی وحدت کو قابل قبول بنانے کی کوشش ہی تو قرار دیا جا سکتا ہے ۔ یا پھر متضاد و متخالف معنویتوں کے حامل ان استعاروں اور پیکروں کے ذریعے لاشعوری محرومی کی تلافی کرنے کی خواہش کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے ۔ تلافی کی اس ادبی کوشش کا نتیجہ ہی تو ہے کہ ان کی شاعری میں محبت اور محبوب کے لیے نور و صدا کے پیکر کثرت سے پائے جاتے ہیں ۔ جن کا ذکر اس سے قبل تفصیل سے کیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ ان کی تخلیقات میں ایک لفظ ''سجدہ'' بھی یہاں تہاں ملتا ہے ۔ اس کی موجودگی کا بھی یہی جواز ہے ۔ قول محال یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے پیار کو، شبنم کی پاکیزگی اور سجدے سے استعارہ کرتے ہیں اور انھیں تقدیس کا حریری جامہ پہناتے ہیں تو دوسری طرف اسے عیش اور گناہ سے تعبیر بھی کرتے ہیں ۔ ایک طرف وہ سجدہ کی خواہش بھی رکھتے ہیں تو ساتھ ہی لب بوسی کی تمنا بھی ۔

ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی
ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خوان حور ہوتی تھی
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہیں اب بھی
نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی
مگر اس عیش رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

طور (سرخ سویرا)

پیشانی میں سجدہ طوفان کا، لب بوسی کی خواہش ہونٹوں میں

لمحہ رخصت (سرخ سویرا)

تمھیں کچی کلی کی بے زبانی سے شکایت ہے
گنہ نا آشناؤں کی جوانی سے شکایت ہے

(سرخ سویرا)

ان مثالوں میں سجدہ جہاں تقدیس یا مادرانہ پیکر کا استعارہ ہے تو وہیں عشق رفتہ، گنہ اور عشق، جبلت کا استعارہ۔ لیکن یہ قول محال، یہ تضاد فکری ان کی ابتدائی شاعری تک ہی ہے۔ یعنی جب مخدوم عشق کو داخلی سطح پر محسوس کرنے لگے تو عشق اور شفقت کو باہم آمیز کر کے ''مادر محبوب (Mother-Beloved)'' کا پیکر خلق کرنے میں وہ کامیاب ہوئے۔ چوں کہ مخدوم کا محبوب ماں کی طرح شفیق اور غم گسار بھی تھا، لہٰذا محبوب کا غم، محض محبوب کے کھو جانے کا غم نہیں بلکہ بیک وقت محبوب اور مادرانہ شفقت سے محروم ہونے سے عبارت ہے۔ محبوب کے آنے کی آس تو رہی نہیں، لہٰذا شاعر کو ماں کا یاد آنا لازمی ٹھہرا۔

ماں یاد آتی ہے، جاتا ہوں میں
میں نے تورات وانجیل وقرآن میں

برمیہ، ہاجرہ اور یعقوب
کے کرب کی داستانیں پڑھی ہیں
ان کا رونا سنا ہے
اور رویا بھی ہوں
آج بھی رو رہا ہوں

رات کے بارہ بجے (بساط رقص)

گویا وہ طفلک بے پدر، وہ طفلک محروم شفقت مادر، وہ عاشق گم کردہ محبوب ..... رونے لگا، روتا رہا، مخدوم جان گئے تھے کہ زمانے کے پاس نہ تو اتنی فرصت ہے نہ اتنا احساس کہ وہ ان کی آوازوں میں گونجتے سناٹے کو محسوس کر سکے۔ ان کی باتوں کی روشنی میں چھپے اندھیرے کو محسوس کر سکے۔ ان کی سرشاری میں موجزن بے کیفی کو جان سکے۔ ان کے آنسوؤں کی گرمی اور نمی کو محسوس کر سکے۔ لہٰذا انھوں نے نظمیں لکھیں۔ شاعری کی۔ نور و صدا کی شکست کی شاعری۔.....

حوالے:

1۔ ''1942ء سے 1950ء تک کے پورے دور میں مخدوم کا سب سے زیادہ قابل ذکر شعری کارنامہ ہے کہ اس نے کوئی نظم نہیں لکھی۔''
عالم خوندمیری، ''مطالعہ مخدوم بتوسط شعر''، صبا کا مخدوم نمبر.....
(مکتبۂ صبا، حیدرآباد، ص:85)

2۔ ''1952 تا 1955ء کے درمیان مخدوم نے شاید ہی کچھ لکھا ہو۔ وہ اس عرصے میں بیرون ملک سفر میں مصروف رہے۔''

راج بہادر گوڑ مترجم باقر محسن۔ مخدوم اپنی ذات میں ایک انجمن۔
شعروحکمت (کتاب 9)، مارچ 2008ء، حیدرآباد، ص: 47)

3۔ مخدوم محی الدین ۔ پڑھنے والوں سے (پیش لفظ) گل تر اگست 1961ء
مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 3

4۔ مخدوم محی الدین ۔ پڑھنے والوں سے (پیش لفظ) گل تر اگست 1961ء
مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 5

5۔ باغی، لمحہ رخصت، جوانی، سرخ سویرا، پہلا ایڈیشن 1944ء
اشاعت گھر، حیدرآباد۔ بالترتیب ص: 9، 25 اور 27

6۔ انتظار۔ سرخ سویرا۔ پہلا ایڈیشن (جنوری 1944ء)
اشاعت گھر، حیدرآباد۔ بالترتیب ص: 36

7۔ بلّور، بساط رقص دوسرا ایڈیشن (مئی 1976ء)، ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد۔ ص: 230

8۔ غزل۔ گل تر۔ پہلا ایڈیشن (اگست 1961ء)، مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 38

9۔ خواہشیں۔ بساط رقص دوسرا ایڈیشن (مئی 1976ء) ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ ص 216

10۔ جز تیری آنکھوں کے۔ بساط رقص (مئی 1976ء) ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ ص: 238

11۔ وقت، بے درد مسیحا۔ بساط رقص (مئی 1976ء)، ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد۔
ص: 236

12۔ غزل۔ گل تر (اگست 1961ء) مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 36۔

13۔ عالم خوندمیری۔ مطالعہ مخدوم بتوسط شعر۔ مخدوم نمبر صبا، مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 89

14۔ عالم خوندمیری۔ مطالعہ مخدوم بتوسط شعر۔ مخدوم نمبر صبا، مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 89

15۔ غزلیں۔ گل تر (اگست 1961ء، مکتبۂ صبا، حیدرآباد
ص: بالترتیب: 40, 36, 34, 32, 26۔

16۔ غزلیں۔ گل تر (اگست 1961ء، مکتبۂ صبا، حیدرآباد
ص: بالترتیب: 40, 30, 28, 26۔

17۔ غزلیں۔ گل تر (اگست 1961ء، مکتبۂ صبا، حیدرآباد
ص: بالترتیب: 57, 52, 50, 46۔

18۔ غزلیں۔ گل تر (اگست 1961ء، مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 61

19۔ غزل۔ بساط رقص (1998ء)، آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی
حیدرآباد۔ ص: 157

(نوٹ یہ غزل اس ایڈیشن میں گل تر والے حصے میں شامل کردی گئی ہے۔ جب کہ
گل تر کے پہلے ایڈیشن میں یہ غزل شامل نہیں ہے)۔

20۔ احساس کی رات۔ بساط رقص (مئی 1976ء) ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد۔ ص: 166

21۔ زینت ساجدہ۔ من ترا حاجی بگویم، بساط رقص (مئی 1976ء)، ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ ص: 20

22۔ عالم خوندمیری۔ مطالعۂ مخدوم بتوسط شعر۔ مخدوم نمبر صبا،
مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 88

23۔ عالم خوندمیری۔ مطالعۂ مخدوم بتوسط شعر۔ مخدوم نمبر صبا، مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 89

24۔ عالم خوندمیری۔ مطالعۂ مخدوم بتوسط شعر۔ مخدوم نمبر صبا، مکتبۂ صبا، حیدرآباد۔ ص: 87

25۔ سناٹا۔مخدوم محی الدین ۔گل تر (اگست 1961ء)،مکتبۂ صبا،حیدرآباد۔ص:79
26۔ مخدوم محی الدین ۔وادی فردا۔ بساط رقص (مئی 1976ء)،ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ص:210
27۔ مخدوم محی الدین ۔وقت، بے درد مسیحا۔ بساط رقص (مئی 1976ء)،ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ص:226
28۔ مخدوم محی الدین ۔اپنا شہر۔ بساط رقص (مئی 1976ء)،ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ص:236
29۔ مخدوم محی الدین ۔رات کے بارہ بجے۔ بساط رقص (مئی 1976ء)،ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ص:245
30۔ مخدوم محی الدین ۔رات کے بارہ بجے۔ بساط رقص (مئی 1976ء)،ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ص:246
31۔ مخدوم محی الدین ۔لختِ جگر۔ بساط رقص (مئی 1976ء)،ادبی ٹرسٹ،
حیدرآباد۔ص:213
32۔ مغنی تبسم ۔مخدوم محی الدین (مختصر سرگذشت) ۔شعر وحکمت (کتاب 9)، مارچ
2008،ادارۂ شعروحکمت،حیدرآباد ۔ص :33
33۔ راج بہادر گوڑ مترجم باقر حسن ، مخدوم اپنی ذات میں ایک انجمن ۔شعر وحکمت
(کتاب 9)2008ء۔ادارۂ شعروحکمت،حیدرآباد ۔ص: 53

☆☆☆

پروفیسر اشرف رفیع
سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

تلاشِ مخدوم ۔تقاضے اور تجاویز

پچھلی صدی کے ابتدائی ستّر برسوں میں جن شاعروں نے علمی ، ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوایا ان میں کئی نام آتے ہیں ۔ان شاعروں میں ایک نام ایسا بھی ہے جو حیدرآبادیوں کے دلوں میں گویا گھر کر گیا ہے اور وہ مخدوم محی الدین کا نام ہے ۔مخدوم صرف اکسٹھ برس چھ مہینے اور اکیس دن زندہ رہے ۔اس مختصر سی عمر میں بقول مخدوم انھوں نے ''کئی عمریں گزاریں'' ۔ ان کا زمانہ سوائے آخری چند سالوں کے قومی اور بین الاقوامی سیاست میں غیر معمولی اضطراب کا زمانہ تھا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریاں ، ہندوستانی رہنماؤں کے اختلافات ،عوامی اور سیاسی تحریکیں ، زرعی اور معاشی تباہی ، غلامی کے قید و بند ، آزادی کی آرزومندیاں ، مزدوروں کی سرمایہ داروں کے ساتھ کشمکش کے علاوہ ایک مقامی محاذ بھی مخدوم اور مخدوم جیسے دردمندوں اور جیالوں کو للکار رہا تھا۔ گھریلو مسائل سے مخدوم بچ نکلے تو بیرونی حالات کی کڑی دھوپ میں جلتے ہوئے پاؤں نے انھیں کبھی چین سے رہنے نہ دیا۔ جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانے میں مخلص دوستوں کی محبت ، مروت کے باوجود ، تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے (جو اس زمانے میں 15، 16 روپیوں سے زیادہ نہ تھے)

اخبار بیچے، ٹیوشن کیے، کسی نواب کی طرف سے ان کی محبوبہ کو انگریزی میں خطوط بھی معاوضہ کے ساتھ لکھے۔ ذہین وفطین تھے اساتذہ میں مقبول بھی رہے۔ اقامت خانے کا قیام مشکل ہوگیا تو اپنے ایک دوست نورالہدیٰ کے ساتھ سلطان بازار بڑی چاوڑی کی ہری مسجد میں رہنے لگے۔ چار پیسے میں چائے کی ایک کپ آتی تھی دونوں آدھی آدھی پیا کرتے تھے۔ یہ گویا مخدوم کی مزدوری کے دن تھے، جہاں انھوں نے غریبوں کی بھوک، پیاس، مجبوریوں اور مصائب کو محسوس کیا۔ ان کے دکھ درد اور کم مائیگی فقر وفاقہ کی تڑپ کا اندازہ کیا۔ زندگی کی ان حقیقتوں نے ان کے عمل کی شعوری سطح کو روشن کرنا شروع کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے علمی، ادبی اور تہذیبی ماحول نے نئی سوچ اور پُراثر طریق کار کے ذریعہ حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیا۔ کام کرنا، کام کرنے والوں کی قدر افزائی کرنا، ان کی عزّت واحترام کرنا تو وہ سیکھ ہی چکے تھے۔ یہ سیکھ مستقبل میں ہر قدم پر ان کے لیے مشعلِ راہ بنی رہی۔ وہ ایک صحت مند سماجی اور معاشی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ ایسی تبدیلی جو کسی بھی طرح کا استحصال کرنے والے سماج کو یکسر بدل دے۔ یہیں سے ان کی روشن خیالی، ترقی پسندی اور ترقی پسند رومانیت کا آغاز ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

رومانیت کا تصور بغاوت کے بغیر نامکمل ہے۔ دراصل رومانیت سے وابستہ پہلا اور بنیادی تصور بغاوت ہی کا ہے۔ بغاوت کے لیے شدید جذباتیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخدوم جذباتیت اور جِبلّت میں ایک حدِّ فاصل قائم کرتے تھے۔ دونوں کا توازن مخدوم کی شخصیت اور شاعری میں کھل کر سامنے آتا ہے۔

مخدوم شاعر سے پہلے بہ حیثیت نثر نگار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کا پہلا مضمون ''گوئٹے کے عاشقانہ خطوط'' 1930ء میں 'مجلّہ مکتبہ' میں شائع ہوا جس کے ایڈیٹر پروفیسر

عبدالقادر سروری تھے۔ 1933ء میں مخدوم نے مشہور زمانہ نظم 'پیلا دوشالہ' ایک انتقامی اور احتجاجی جذبے کے تحت لکھی تھی جسے کالج کی فضاؤں نے بہت دنوں تک اپنے دامن میں سمیٹے رکھا۔ مخدوم کے ساتھیوں کے علاوہ اساتذہ نے بھی اس نظم کی پذیرائی کی۔ یہی وہ نظم ہے جو مخدوم کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر (دوسال قبل ہی) ایک شاندار محفل کا عنوان بنائی گئی۔ 10 دسمبر 1966ء کو مخدوم کا جشن تھا۔ 8 دسمبر کو نواب صارم جنگ بخشی کی دیوڑھی میں ''محفل پیلا دوشالہ'' منعقد ہوئی۔ داعی مرزا ظفر الحسن تھے۔ دوست احباب اور عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کاروں نے قوالی کے انداز میں یہ نظم پیش کی تھی۔

کالج سے نکلے تو مخدوم 1939ء میں سٹی کالج میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ اپنے قلندرانہ مزاج، اس سے زیادہ ترقی پسندانہ خیالات کی ترویج کے باعث بعض ساتھیوں اور عہدہ داروں میں نشانِ ملامت بنے رہے۔ 1942ء میں مالی اعتبار سے آسودہ زندگی چھوڑ کر میدان کارِزار میں اتر آئے۔ مالی آسودگی تو ہاتھ سے گئی مگر نئی نسل کے کئی نوجوانوں کو کمیونسٹ تحریک کا گرویدہ بنادیا۔ مزدوری کا مزہ چکھ چکے تھے اب مزدوروں کے، رہبر ورہنما بن کر سامنے آئے۔ حکومت کے معتوب رہے، روپوش ہوئے، دوتین بار جیل کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔

اس مجاہد، باغی اور رومانی وانقلابی شاعر کی علمی، ادبی رومانی اور انقلابی زندگی صرف 38 سال کی زندگی تھی۔ شعروادب کی دنیا میں 38 سال کا عرصہ کچھ بڑا عرصہ نہیں ہوتا۔ اس مختصر سی زندگی میں مخدوم نے مقبولیت عام وخاص کی جو دولت لوٹی وہ دولت کسی شاعر کو زندگی میں بہت کم نصیب ہوئی ہوگی۔ مخدوم صرف شاعر ہی ہوتے تو وہ شاعروں، ادیبوں اور

دانشوروں ہی کے طبقے میں مقبول رہتے، کسانوں، مزدوروں اور غریبوں کے دلوں میں نہ رہتے۔ انھیں گزرے ہوئے اڑتیس سال چھ مہینے ہو چکے ہیں اس کے باوجود آج بھی مخدوم نہ صرف اپنے چند ہم عصروں، دیدہ وشنیدہ لوگوں کی یادوں میں محفوظ ہیں۔ مخدوم نئی نسل کو بھی اپنے چاہنے والوں کی فہرست میں شامل کرتے جا رہے ہیں۔ 1970ء تک کسی کا جشن کسی کی شامیں منانے کا چلن اتنا عام نہیں تھا لوگوں نے مخدوم کی چاہت میں مخدوم کا ساٹھ سالہ جشن 58 سال کی عمر ہی میں (1966ء) میں منا ڈالا۔ اس شان سے منایا کہ وہ جوش ومحبت پھر کسی اور جشن میں نظر نہیں آئی۔ کہتے ہیں مخدوم کو پہنائے گے ہاروں میں سے ایک ہار مخدوم کے ایک دیوانے نے 500 روپیوں میں خریدا۔

مخدوم کی پیدائش کا اس سال ملک بھر میں جشن صد سالہ منایا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ سمینار ہو رہے ہیں۔ مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ شام غزل سجائی جا رہی ہے، اسٹیج پروگرام ہو رہے ہیں ایسے میں سوچنا یہ ہے کہ ہم مخدوم کی محبت کو مزید کس طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ ان کی زندگی اور رشحات قلم کے وہ کونسے گوشے ہیں جنھیں مزید اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے؟ یا حیات وقلم کے کونسے گوشے ہیں جو اب تک کسی نہ کسی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہے ہیں؟ کھل کر سامنے نہ آسکے۔

میں نے آگے چند توجہ طلب نکات کی طرف اشارے کیے ہیں اور تجاویز رکھی ہیں جو مخدوم کی زندگی نظم ونثر اور قائدانہ جدوجہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

1۔ مخدوم پر سب سے پہلا مونوگراف ڈاکٹر داؤد اشرف نے بعنوان ایک مطالعہ 1966ء میں لکھا تھا جو 1967ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مقالہ کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس کی تمام تر معلومات مخدوم کی زندگی میں اور مخدوم

سے حاصل کی گئی ہیں۔ یہ مقالہ مخدوم کی نظر سے گذر بھی چکا تھا تنقیدی نقطہ نظر سے اس مقالے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ دوسرا اہم کام مطبوعہ شکل میں شاذ تمکنت کا مقالہ ہے۔ شاذ مخدوم کے پرستار تھے مخدوم شاذ کے مشفق ومہربان دوست تھے۔ ادبی اور بے ادبی محفلوں میں دونوں کا اکثر ساتھ رہا۔ ان کے مقالے کا اکثر مواد مخدوم کے بعد مخدوم کے ہم عصروں سے حاصل کیا گیا جس کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ مخدوم کے ایک روسی پرستار الیکسی سوخا چیف نے بھی مخدوم محی الدین، کے عنوان سے 1993ء میں ایک کتاب لکھی ہے۔ سوخا چیف کی معلومات ''نیا آدم'' اور 'صبا' کے خصوصی شماروں پر مبنی سہی لیکن اندازِ فکر میں بلا کا تنوع ہے۔ تجزیہ وتحلیل میں فنی مباحث اٹھائے ہیں۔ مخدوم کے ایک بہت ہی قریبی دوست پروفیسر شفقت رضوی نے ''مخدوم حیات اور ادبی خدمات'' جیسی مختصر سی مگر تحقیقی اعتبار سے نہایت وقیع کتاب لکھ کر مخدوم کی حیات کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مخدوم سے رضوی کے بہت قریبی تعلقات رہے ہیں بقول شفقت رضوی ''میرے بہت سے ظاہری اور باطنی رشتے تھے۔ (مخدوم سے) میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور انھوں نے میری زندگی اور کردار کو سنوارنے میں غیر محسوس طریقے سے رہنمائی کی ہے۔'' اس عقیدت و محبت کے باوجود شفقت رضوی نے تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے دوٹوک بات کی ہے۔ مخدوم پر لکھی تحریروں اور مخدوم کی نگارشات کا تاریخی تعین کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ مخدوم کی ایک نادر و نایاب نظم 'پاکستان

ہمارا' پیش کر کے مخدوم کے طرز فکر کا ایک نیا گوشہ وا کیا ہے مخدوم پر ان اہم چار کتابوں کے علاوہ سیدہ جعفر کی کتاب ،''شعر و حکمت'' کا گوشۂ مخدوم محی الدین دیگر رسائل اور اخبارات میں شائع شدہ مضامین بھی پیش نظر رکھے جا سکتے ہیں۔ان میں زیادہ تر موضوعات کی تکرار ہے۔فکر و فن اور حیات پر جو گفتگو کی گئی ہے اس میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ یکشنبہ 6 فروری 2000ء کے روزنامہ منصف کے ایوان ادب سپلیمنٹ کے گوشہ مخدوم میں دو اہم مضامین سامنے آئے۔ان میں سے ایک تو ڈاکٹر سید حمایت علی کا مضمون ہے ''مخدوم صاحب کے اعزا و اقربا''۔ڈاکٹر سید حمایت علی مخدوم کے خالہ زاد بھائی صبا صاحب کے داماد اور بھتیجے ہیں۔ دوسرا مضمون مشہور خوش نویس محمد ضمیر الدین حذری نفیس القلم نے بعنوان ''محبت اور محنت کا شاعر مخدوم محی الدین'' لکھ کر مخدوم کا شجرہ نسب اور خاندان کے چند اہم واقعات محفوظ کر دیے ہیں۔آج بھی ہمارے درمیان مخدوم کے عزیز' دوست اور دیکھے بھالے ایسے اصحاب اور خواتین موجود ہیں جو مخدوم کی حیات کی ٹوٹی ہوئی زنجیروں کو جوڑ سکتے ہیں، ان میں ڈاکٹر زینت ساجدہ ، جیلانی بانو ، واجدہ تبسم ، فاطمہ عالم علی مخدوم کی صاحبزادی ذکیہ عرف اساوری ، باجی جمال النساء مخدوم کے داماد سید عبدالرحیم قادری ،مخدوم کے صاحبزادے نصرت محی الدین ،ظفر محی الدین ،محمد ضمیر الدین حذری ، ڈاکٹر سید حمایت علی ، راج بہادر گوڑ ،منوہر راج سکسینہ، اعجاز قریشی ،مصحف اقبال توصیفی ، پروفیسر مغنی تبسم ، پروفیسر انور معظم ، راشد آزر ، یوسف ناظم ، ڈاکٹر داؤد اشرف ، بی

نرسنگ راؤ مشہور صحافی مصطفیٰ علی اکبر مجتبیٰ حسین بفضل تعالی موجود ہیں۔ مخدوم کے نام کے ساتھ بعض ایسی خواتین کے نام بھی آتے ہیں جو legend کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان خواتین و حضرات سے کوئی جفاکش اسکالر استفادہ کر کے مخدوم کی حیات کے اکسٹھ سال چھ مہینے کی تحسیب و تہذیب کا احاطہ کر سکتا ہے۔

2۔ مخدوم جنسی نراج کے نہیں بلکہ آزاد محبت کے قائل تھے۔عورت کے معاملے میں ان کا مشرب بہت وسیع تھا۔''مزدور کسان کی بیٹی ہو یا راج کماری ہو یا مالوے کی من موہنے والی سرزمین کی دوشیزہ' اگر وہ ان کے سازِ دل کے تاروں کو چھیڑ دیتی اور انھیں اس کی کوئی ادا بھا جاتی تو پھر وہ ان کی آنکھوں کا تارا' ان کے سجدوں کا مسجود اور جانِ غزل بن جاتی تھی۔'' (مرزا حیدر حسن (لندن) یاد باراں میں ایک جامِ غم اور دو نیا آدم۔ص 125) مخدوم کی 1952ء سے 1968ء تک کی شاعری میں محبت اور شائستگی محبت اور تہذیب محبت کا دل کش اور پاکیزہ امتزاج ملتا ہے۔اخلاص کے ساتھ ساتھ معنویت کا یہ عالم ہے کہ ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔کسی نازک لمحے میں ایک پیکر حسن سے انھوں نے کہا تھا ''بس دس سال کی Poetry اور مجھے دے دو'' شکیلہ بانو بھوپالی کی قوالی ، سدھیشوری دیوی کی شعلہ نوائی کے مخدوم قدرداں تھے اور وہ مخدوم کے شیدائی۔کیا ہی اچھا ہو شاعر کی زندگی کا یہ حسین پہلو بھی کسی اسکالر کو اپنی طرف متوجہ کر لے۔

3۔ مخدوم مارکسی نظریہ کے پابند تھے لیکن اس پابندی کے باوجود سکہ بند اور

مشروط طرز احساس و اظہار کے قائل نہ تھے۔ مخدوم کے یہاں خارجی دباؤ، داخلی اُپج پر اکثر حاوی رہا۔ ان کے ابتدائی دور کی شاعری کا ایک بہت بڑا حصہ ان کے سیاسی، سماجی اور مفکرانہ خیالات پر مبنی رہا ہے۔ ایک عام شاعر کے مقابلے میں جو چمچاتی گاڑیوں، شاندار بنگلوں میں رہ کر غریبوں کی ہمدردی کا ڈھونگ کرتے رہے ہیں ان سے مخدوم میں دوسروں کو متاثر کرنے کی زیادہ صلاحیت تھی۔ جب تک کوئی نظریہ حیات متعین نہ ہو اور خود متعین راہ پر گامزن نہ ہوں دوسروں کو متاثر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اب ہمارے اسکالرز اور دانشوروں کو مخدوم کی حیات، شاعری اور دیگر تحریروں کے آئینے میں یہ دیکھنا ہے کہ حیات انسانی کے تعلق سے مخدوم کا رویہ کیا تھا؟ مارکسی نظریۂ حیات کا وہ کس حد تک نمونہ ثابت ہوئے۔

4۔ مخدوم کی زندگی کا طالب علمانہ دور بھی بڑا زرخیز دور رہا ہے۔ اس دور میں مخدوم نے بہترین طالب علم، وسیع النظر اور حساس نوجوان کی طرح نصابی کتابوں کے باہر بھی زندگی گزاری ہے۔ ان کے قلم نے وہیں پہلی نظم لکھی اور اس سے پہلے نثری کارنامہ بھی رقم کیا۔ مخدوم سے کئی لطیفے (جامعہ اور جامعہ کے باہر) منسوب رہے۔ یہ لطیفے مخدوم نے خود مدون کیے تھے ان کے سبھی سوانح نگار اس بات کا ذکر کرتے ہیں مگر کسی نے نہ اُن لطیفوں کو تلاش کیا نہ ان کے نثری کارناموں پر علاحدہ سے کوئی مقالہ لکھا نہ ہی مخدوم کے ان ڈراموں پر کچھ لکھا جس میں انھوں نے اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اداکاری بھی ایسی کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے اسٹیج پر آکر انھیں گلے لگا لیا،

مبارکباد دی اور شانتی نکیتن میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مدعو کیا۔ حیدرآباد میں کھیلے جانے والے ان ڈراموں کی بڑی اہمیت ہے۔ اس موضوع پر اگر کام ہو تو نہ صرف اردو ڈرامے کے سرمایہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا بلکہ جو کردار مخدوم نے ادا کیے ہیں اس سے ان کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

5۔ مخدوم شعریت کے شاعر تھے۔ جہاں تک تغزل میں جمالیات کا تعلق ہے وہ اپنی پوری توانائی اور رعنائی کے ساتھ مخدوم کی جمالیاتی حس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر ان کی شاعری، اچھوتے موضوعات، اسلوبیات، لفظیات، علامات، اشارات، تلمیحات پر بھرپور گفتگو نہ ہوسکی۔ یہ موضوع آج بھی توجہ طلب ہے۔

6۔ اردو میں خطوط نویسی کی غالب سے پہلے کوئی زیادہ اہمیت نہیں تھی غالب نے اپنے اسلوب اور مواد کی تازگی سے خطوط نویسی کو ایک فن بنا دیا۔ مخدوم نے بھی اپنی زندگی میں کئی خطوط لکھے، اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی۔ ان خطوط کی روشنی میں مخدوم کی نجی زندگی معاشی پریشانی، دلی کیفیات الجھنوں اور آرزوؤں کا پتہ چلتا ہے ان خطوط کو یک جا کر کے طبع کیا جائے تو خطوط نگاری میں مخدوم کا مقام متعین ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی مخدوم کی حیات اور عصر کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

7۔ مخدوم نے ایک واسوخت بھی لکھا ہے۔ اس واسوخت میں ایک خاص اثر ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہوسکتا اگرچہ ان

کی یہ واسوخت ان کی ذاتی واردات کا پتہ دیتی ہے اور تجربات کی ۔لیکن اس کی اذیت ناکی ، اس کی روانی ، الفاظ کا انتخاب اور استعمال لاجواب ہے۔اس واسوخت کے حوالے سے مخدوم کی زندگی کا ایک نیا ورق سامنے آسکتا ہے۔

8۔ ترجمہ نگاری ایک خاص فن ہے جس میں کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔مخدوم نے منظوم ترجمے بھی کیے اور منثور بھی۔کیا ہم نے آج تک ان کی ترجمہ نگاری پر ایک مقالہ بھی لکھا ہے؟

9۔ مخدوم پر ان کے زمانے میں اور ان کے بعد آج تک بھی بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ ان کی وفات کے بعد کئی تعزیتی جلسے ہوئے تعزیتی نظمیں لکھی گئیں۔ تعزیت نامے ۔تعزیتی پیامات وصول ہوئے۔ وہ سب یا تو ان کے صاحبزادے کے پاس محفوظ ہوں گے یا پھر مخدوم بھون میں ۔ان سب سے بہت کچھ تو اس وقت کے اخبارات و رسائل میں بھی بکھرے پڑے ہیں۔ مخدوم نے چند کتابوں پر اپنی آراء بھی لکھی ہیں۔کچھ اہم تنقیدی مضامین بھی اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ان سب کو اکٹھا کیا جائے اور وضاحتی اشاریہ تیار کیا جائے تو مخدوم سے محبت وعقیدت کا ایک دستاویزی ثبوت بن سکتا ہے۔

10۔ مخدوم جیسا البیلا ،قلندر مزاج ،حسن شناس ،شوخ وشائستہ ، مہذب ومعتبر ادیب وشاعر ،لیڈر ، رہبر ورہنما انسان اگر مغرب کے کسی ملک میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کا ایک میوزیم تیار کیا جاتا۔مخدوم بھون حمایت نگر کے کسی ایک

کمرے میں۔ مخدوم کو کیا یہ اعزاز نہیں دیا جاسکتا۔

11۔ مخدوم ایک ایسے دور کے شاعر ہیں جس میں بہت سے نامور شاعر موجود تھے ان میں بیشتر کسی نہ کسی پہلو میں انفرادیت رکھتے تھے ان میں مجاز ، فیض ، سردار جعفری ، جاں نثار اختر ،اختر الایمان ،جگر، یگانہ ، فانی ، مجروح ، شاہد صدیقی اور آگے بڑھیں تو اقبال اور جوش تو سرخیل ہی تھے ان شاعروں نے اپنی اپنی سطح پر ایک نئے آہنگ کے ساتھ ادبی راہیں استوار کیں۔ اقبال اور جوش نے تو ایک پوری نسل کو متاثر کیا۔کیا مخدوم ان میں سے کسی سے متاثر رہے؟ کیا اپنے اطراف کے شاعروں کو کسی طرح متاثر کیا ؟ کیا ہم اس طرح کے مطالعات پیش کر کے مخدوم شناسی کو تازگی نہیں بخش سکتے۔

سب سے آخر میں اس سمینار کے حوالے سے میں حکومت ہند سے درخواست کرتی ہوں کہ جس طرح مجاز پر ایک ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا ہے اسی طرح مخدوم محی الدین جیسے فریڈم فائٹر ،شاعر ،ادیب ،فن کار ، رہبر ورہنما پر بھی اس جاریہ سال میں ایک خوب صورت سا ڈاک ٹکٹ جاری کیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ سمینار کی اس مجلس میں شریک تمام اہلِ قلم ، اہلِ علم میری اس تجویز کی تائید کریں گے۔

☆☆☆

پروفیسر ایس۔اے وہاب قیصر
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مخدوم.....رجائیت کی منفرد آواز

کسی ملک کے سنگین سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات اکثر لوگوں کو یا تو قنوطیت پسند بنا دیتے ہیں یا وہاں کے لوگ ان حالات سے مسلسل گزرتے ہوئے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ جب کہ ہر دور میں ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو ناآسودہ حالات کا سختی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ہمت، جرات اور شجاعت رکھتے تھے۔ وہ ناموافق حالات سے مایوس ہوئے بغیر اپنے گرد و پیش کے ماحول کے سدھار کے لیے جدوجہد کرتے اور اپنی کامیابی اور شاندار مستقبل سے پرامید رہتے۔ ان کی سوچ میں، نظر میں، مزاج میں، رویے میں اور فعل و عمل میں رجائیت (Optimism) کوٹ کوٹ کر بھری رہتی۔ ان ہی شخصیتوں میں مخدوم کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی رجائیت کے بارے میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

> ''مخدوم کے پاس آرزو ہے، مگر غمِ آرزو نہیں۔ حال کی نا آسودگی سے وہ تڑپ جاتے ہیں لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے، کیوں کہ وہ مستقبل سے مایوس نہیں۔ وہ امید سے خوشی اور جدوجہد سے اعتماد حاصل کرتے ہیں''۔
> (بساطِ رقص، صفحہ ۲۲)

مخدوم ایک فعال شخصیت کے مالک، چوٹی کے شاعر اور ٹریڈ یونین لیڈر تھے۔ وہ اپنے دور کے عظیم کمیونسٹ رہنما رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے علاوہ اشتراکیت اور مارکسزم کے وہ کٹر حامی تھے۔ وہ نڈر اور بے باک انسان تھے۔ ان کے حوصلے کافی بلند تھے۔ شاعری کے علاوہ وہ اپنے قلم سے تلوار کی کاٹ کا کام بھی لیتے تھے۔ ملک کی آزادی کے لیے ان کا دل تڑپ اٹھتا اور انھیں یقین تھا کہ وہ وقت بہت جلد آئے گا جب ہمیں آزادی ملے گی۔ ان کی نظم ''آزادیِ وطن'' میں رجائیت اور ولولہ انگیزی ملاحظہ کیجیے۔

قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہوجائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سوجائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کردیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی

نظم ''موت کا گیت'' میں جوش، ولولہ اور اپنے مقصد میں کامیابی کا یقین دیکھیے:

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

نظم ''باغی'' میں ان کی طاقت اور خودآگہی کا اظہار ہوتا ہے۔

رعد ہوں برق ہوں بے چین ہوں پارا ہوں میں
خود پرستار ' خود آگاہ خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلادے وہ شرارا ہوں میں

انقلابی نظموں میں ''جنگ'' مخدوم کی پہلی سیاسی نظم تھی۔ ''اندھیرا'' ان کی سیاسی اور انقلابی نظموں میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ بقول سبطِ حسن نظم ''جنگ'' اردو شاعری میں فاشزم کے خلاف پہلی صدائے احتجاج تھی۔ ''حویلی'' بڑی پراثر نظم ہے۔ مخدوم کی تاثراتی نظمیں اسی وقت ہوتی تھیں جب کہ ان پر ایک کیفیت طاری ہوتی۔ چنانچہ ''اندھیرا'' اور ''قمر'' دونوں ہی نظمیں کیفیت طاری ہونے کے بعد ہی ہوئی تھیں۔ پہلی نظم کلاس روم میں پڑھانے کے دور میں اور دوسری نظم اس وقت ہوئی جب کہ وہ احباب میں گھرے تھے۔ نظم ''قید'' جیل میں ہوئی اور ''تلنگانہ'' روپوشی کے دوران۔ نظمیں ''چاند تاروں کا بن'' اور ''سپاہی'' ٹرین میں ہوئیں اور ''دھواں'' آصف سابع کی سلور جوبلی پر۔ یہ نظمیں کہیں بھی کسی بھی حالت میں ہوئی ہوں' ان میں ایک قدر مشترک ہے اور وہ ہے رجائیت۔ چنانچہ مخدوم کی انقلابی نظموں میں پائی جانے والی رجائیت پر شاذ تمکنت اپنی کتاب ''مخدوم محی الدین' حیات اور کارنامے'' میں یوں رقم طراز ہیں:

'' سرخ سویرا کی انقلابی نظمیں اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے رجائیت کی مثال پیش کرتی ہیں جو کبھی فطری اور کبھی غیر فطری لگتی ہیں۔ اس مجموعے کی انقلابی نظموں میں فکر کم اور مزاجیت زیادہ لگتی ہے۔ انقلاب کا رومانی تصور جابجا کارفرما نظر آتا ہے۔''

(صفحہ 143)

سرخ سویرا کی نظموں کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ واقعی ان کے اختتام پر رجائیت غالب ہے اور ان میں انقلاب کا رومانی تصور بھی رواں دواں ہے۔ اب یہ رجائیت فطری ہے یا غیر فطری' ان میں فکر کی کمی ہے یا مزاجیت کی زیادتی اس میں تو شاعر کا اپنا تاثر کارفرما ہوتا ہے۔ شاعر پر جب شعر کی آمد آمد ہوتی ہے تو فطری یا غیر فطری کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ غزل کے شعر ہوں کہ نظم کے بند' ان میں کبھی شاعر کی فکر کا غلبہ ہوتا ہے تو کبھی اس کے مزاج کا۔ اس طرح مخدوم کی نظموں میں یہ ساری باتیں نمودار ہو سکتی ہیں۔ بہر حال ان کی چند نظمیں ایسی ہیں جو رجائیت پر ختم ہوتی ہیں۔ مشرق' نامۂ حبیب' سپاہی' جنگِ آزادی' بنگال' تماشائی اور تلنگانہ' رجائیت پر ختم ہونے والی نظمیں ہیں۔ ان میں چند نظموں کا اختتام دیکھیے:

جنوں پرور اداؤں سے سنورنے کے ارادے ہیں
خدا کے عرشِ الفت سے اترنے کے ارادے ہیں
زمین وآسماں کو ایک کرنے کے ارادے ہیں
کہا ہے مجھ سے جنگل کی اُن آوارہ ہواؤں نے
جو تیری دھڑکنوں کا تحفہ میرے پاس لاتی ہیں

(نامۂ حبیب)

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے!
کھل گیا انقلابی پھریرا

(سپاہی)

لوسرخ سویرا آتا ہے آزادی کا آزادی کا

گلنار ترانہ گاتا ہے آزادی کا آزادی کا

دیکھو پرچم لہراتا ہے آزادی کا آزادی کا

یہ جنگ ہے جنگ آزادی

آزادی کے پرچم کے تلے

(جنگ آزادی)

بدل رہی ہے یہ رنج وعذاب کی دنیا

ابھر رہی ہے نئے آفتاب کی دنیا

نئے عوام نئی آب وتاب کی دنیا

وہ رنگ ونور کی محفل شباب کی دنیا

(تلنگانہ)

1940ء میں ریاست حیدرآباد میں جب آل انڈیا اسٹوڈنٹس یونین کا قیام عمل میں آیا تو مخدوم نہ صرف اس کی گروپ میٹنگوں میں شریک رہتے بلکہ نوجوانوں میں جوش وخروش پیدا کرنے اوران کے حوصلے بڑھانے کے لیے رجائیت سے بھرپور نظمیں سنایا کرتے تھے۔ جنگِ آزادی، سپاہی اور کہو ہندوستان کی جئے جیسی پرجوش نظمیں سن کر نوجوانوں میں ایک نئی امنگ پیدا ہوتی۔

اس طرح مخدوم نے اپنے دور کے نوجوانوں میں ذہنی بیداری پیدا کی اوران کی تمام تر توجہ اپنے مقاصد کے حصول کی سمت مبذول کروائی۔ انہوں نے نوجوانوں کو نہ صرف انقلابی پیام دیا بلکہ انہیں باور کروایا کہ وہ متحد اور منظم رہ کر اپنے ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ ان کی رجائیت پسندی پر

سیدہ جعفر اپنی کتاب ''مخدوم محی الدین'' میں یوں اظہار خیال کرتی ہیں:

''مخدوم نے زندگی سے کبھی ہار نہیں مانی، کبھی حالات سے آزردہ نہیں ہوئے کیوں کہ انھیں اپنے مقصد اور نصب العین کی عظمت اور صداقت پر کامل یقین تھا۔ مخدوم نے اشتراکی نظریات کو وقت کے فیشن کے طور پر قبول نہیں کیا تھا بلکہ انھوں نے اس کی اصل روح سے آشنا ہو کر اسے اپنایا تھا۔.....یہی نظامِ فکر مخدوم کی شاعری کا بنیادی محرک بن گیا تھا۔ مخدوم کو یقین تھا کہ ایک دن عوامی جدوجہد رنگ لائے گی اور نیا سورج طلوع ہوگا۔ ان کی شاعری اور شخصیت میں رجائیت کے عناصر نے ایک نیا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ مخدوم اپنی کشمکش سے پُر باعمل زندگی اور اپنے جہد مسلسل سے ناامید نہیں تھے۔

مرمریں صبح کے ہاتھوں میں جھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا ''

(صفحہ 32)

ایک اور مقام پر وہ لکھتی ہیں:

''مخدوم کے دورِ آغاز کی شاعری میں اپنے نصب العین پر ایقان نے انھیں حالات کی گرانباری کے باوجود زندگی کا نوحہ خواں نہیں بنایا۔ انھوں نے موت کے رقص میں زندگی کی حرکت اور بقا کا ارتعاش محسوس کیا۔ اس لیے مخدوم تاریکی سے گھبرائے نہیں اوران کی یہ رجائیت بے مقصد خوش

فہمی ثابت نہیں ہوئی ۔ ہندوستان کی آزادی حالات کی بعض
ناہمواریوں کے باوجود برطانوی استبداد اور بدیسی سامراج
سے نجات کا مژدہ تھی۔'' (صفحہ 51)

مخدوم نے صرف انقلابی نظمیں ہی نہیں لکھیں بلکہ انہوں نے سیاست کے شاہی نظام، جبر و استبداد اور فرسودہ روایات کے خلاف آواز اٹھائی اور ان کو ختم کرنے کے لیے عملی طور پر ڈٹے رہے۔ یہی وجہ رہی کہ انھیں ایک طویل عرصے تک روپوش ہونا پڑا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں۔

مخدوم کی رجائیت کو سید محمد عقیل نے اپنے ایک مقالے ''مخدوم ۔فکر و نظر کے کچھ پہلو'' میں ایک دوسرے ہی انداز سے پیش کیا ہے:

''جب 1944ء میں ان کا پہلا مجموعہ 'سرخ سویرا' شائع ہوا تو
ترقی پسند تخلیقات میں مخدوم کی ایک منفرد منزل نظر آئی۔ ان کی
نظمیں' یہ جنگ ہے جنگ آزادی' سناٹا' سپاہی اور انتظار بچے
بچے کی زبان پر چڑھ گئیں' جن میں ماحول کے تقاضوں اور
روح عصر کی گرمی کے ساتھ وہ انقلابی کیفیت بھی موجود تھی جو
اس وقت کی ہندوستانی فضا میں کروٹیں لے رہی تھیں اور جس
میں 'ماضی کی طرف واپسی' نہیں بلکہ ایک بہتر زندگی اور آزاد
فضا کی تلاش شامل تھی۔ مستقبل سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں اور
سماج کو اپنے پرانے خول کو توڑ کر باہر آنے پر اکسانے کی جہد۔''

(تنقید اور عصری آگہی' صفحہ 146)

مخدوم میں بلند حوصلگی اور بلا کی ہمت تھی تب ہی تو ان کے چہرے پر مایوسی کی ایک جھلک بھی کسی نے نہیں دیکھی بلکہ ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ ہی کھیلتی رہی۔ ملک اور قوم کے شاندار مستقبل سے وہ ہمیشہ پُر اُمید رہا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح وشام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

.....

انساں کی آرزو نے انساں کی جستجو نے
گرتی ہوئی زمیں کو آکاش میں اچھالا
وہ موڑ آگیا ہے مشرق کی زندگی میں
ہر گام پر سویرا' ہر سو نیا اجالا

.....

آج اپنا گھر عدو کی رہگذر ہی کیوں نہ ہو
ہم بڑھے جائیں گے رستہ پُر خطر ہی کیوں نہ ہو
ہم لڑے جائیں گے دشمن بد گُہر ہی کیوں نہ ہو
اپنی وردی خاک وخوں میں تر بتر ہی کیوں نہ ہو

.....

نہیں رکھتے ہیں کچھ بھی ، نورِ عرفانی تو رکھتے ہیں
محل رکھتے نہیں ہیں ، زورِ طغیانی تو رکھتے ہیں

.....

ہاں بڑھے گا زندگی کا کاروان تیز گام
لیں گے ہم لیں گے شہیدوں کے لہو کا انتقام
عہد کرتے ہیں مٹا دیں گے یہ سولی کا نظام
آل لینن آل استالین کا زندہ ہے نام

.....

اٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہمکنار کریں

اس طرح مخدوم کی بیشتر سیاسی اور انقلابی نظمیں ان کی رجائیت پسندی کی عکاس ہیں اور ان میں اس دور کے فرسودہ نظام اور انگریزوں کے تسلط سے دیش واسیوں کو چھٹکارہ دلانے کا عزم، حوصلہ اور امید کھلے طور پر نظر آتی ہے۔ اسی لیے وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

☆☆☆

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
سابق صدر شعبۂ اردو، ایس وی یونیورسٹی، تروپتی

مخدومؔ کی انقلابی شاعری

مخدومؔ کو یاد کریں تو محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اپنے آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ اپنے ماضی، اپنے حال اور اپنے مستقبل میں زیست کر رہے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ مخدومؔ کا وطن بھی حیدرآباد تھا ..... جی نہیں، مخدومؔ کا وطن نہ حیدرآباد تھا، نہ دِلّی، نہ صفاہان نہ سمرقند! مخدومؔ کا وطن تو ہر وہ دل تھا جس میں انقلاب اور آزادی کے جذبات پرورش پا رہے تھے جس میں آج بھی انسان دوستی کے چراغ جلتے ہیں اور محنت اور محبت کے پھول کھلتے ہیں۔ مخدومؔ نے رومانی شاعری کی اور بڑی خوب صورت رومانی شاعری کہ اردو کی رومانی شاعری کے کسی بھی انتخاب میں اُن کی چند نظمیں تو ضرور شامل کی جاسکتی ہیں۔ مخدومؔ کی رومانی شاعری میں بعض لپکے اور دل کو چھونے والے اشعار ملتے ہیں جن کا روایتی رومانی شاعری سے کوئی علاقہ نہیں بنتا۔ مخدومؔ کی انفرادیت اِن میں جھلکتی ہے۔ لیکن آج ہم جس شاعر مخدومؔ کا تصور اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں وہ رومانی شاعری والا مخدوم نہیں انقلابی رجحانات کی حاملِ شاعری والا مخدوم ہے۔ اور آج اس تحریر کا موضوع بھی کچھ یہی ہے۔

مخدومؔ کا خاندانی پس منظر اور اُن کا گھرانہ بڑا لیادیا، رکھ رکھاؤ کا حامل اور مذہبی گھرانہ تھا۔ یہ بات خود حیرت انگیز ہے کہ ایک ایسے گھرانے کا فرد کمیونسٹ پارٹی کا رکن ہی نہیں اس کا

سربرآوردہ قائد بنتا ہے۔ انقلابی ذہن پاتا ہے اور ملک و معاشرہ کی تقدیر بنانے میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ مخدوم کے اس بندھے ٹکے گھریلو ماحول کے باوجود' مخدومؔ کے چچا محمد بشیر الدین کی سیاست سے دل چسپی' گھر میں انقلاب روس کی باتیں' گاندھی جی' علی برادران اور بی امّاں کے قصّے' ابتدائی دور میں اُن کی ذہنی تربیت میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ پھر ہوا یہ کہ سبھاش چندر بوس اور پنڈت نہرو سے وہ متاثر ہوئے اور اپنی طالب علمی کے زمانے اور بعد میں نہرو' ٹیگور اور گاندھی سے اُن کی ملاقاتیں رہیں۔ سرمایہ داری اور فاشزم کے خلاف اُن کے ذہن کی نشو ونما میں اِن شب و روز کا بڑا حصہ رہا۔ اس زمانے میں ملک کے نوجوانوں میں بھی عام طور پر بائیں بازو کے رجحانات ابھر رہے تھے۔ سبط حسن نے مخدوم کے موسومہ اپنے خط مورخہ 25 دسمبر 1943ء میں جس کو اشاعت گھر حیدرآباد نے مخدومؔ کے مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' کے دیباچہ کے طور پر شائع کیا ہے۔ یہ بجا طور پر لکھا ہے۔ ''تمھاری (یعنی مخدوم کی) شاعری عصرِ حاضر کے اضطراب اور احساس کی آئینہ دار ہے''۔

1934ء میں مخدومؔ کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوتے ہیں اور 1941ء میں ہمہ وقتی رکن کی حیثیت سے انھوں نے خود کو پارٹی کے لیے وقف کر دیا۔ یہ دور ہندوستان کی قومی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عالمی سرمایہ داری کے بحران کا عروج' کانگریس ہی میں کانگریس سوشلست پارٹی کا قیام' آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن' آل انڈیا ٹریڈ یونین اور ان سب کے نتیجے میں ہڑتالیں' کسان تنظیم' مخالف زمین داری جدوجہد' مخدوم کے خیالات میں تبدیلی لانے اور انقلابی رجحانات کو شدید کرنے کے لیے فضا ہموار کرتے ہیں۔ اور پھر حیدرآباد میں کامریڈ اسوسی ایشن کا قیام جس کے مرکزی کردار مخدوم تھے' آگے چل کر مخدوم کو زندگی کو دیکھنے و نیز قومی اور بین قومی سیاست کا مطالعہ کرنے کے مواقع ملے۔ بتدریج اُن

کے انقلابی رجحان نے اپنی سمت کا تعین کر لیا۔ نظم ''باغی'' کا پہلا بند پڑھیے۔

رعد ہوں ، برق ہوں ، بے چین ہوں ، پارا ہوں میں
خود پرستار ، خود آگاہ ' خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلادے وہ شرارا ہوں میں
میری فریاد پہ اہلِ دول انگشت بہ گوش
لا تبر ' خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

ملکی اور عالمی' ہر دو سطحوں پر یہ عہد' ہنگاموں کا عہد تھا۔ فاشزم کی تباہ کاریاں وسعت پا رہی تھیں۔ استحصالی نظام اپنے پاؤں پھیلا رہا تھا۔ سامراجی طاقتیں درپے آزار تھیں۔ کمزوروں ، کسانوں ، محنت کشوں ، مزدوروں کا حال دنیا بھر میں اور خاص طور پر مشرق میں ناگفتہ بد تھا۔ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھانے پر تُلی تھیں۔ ظلم اور استبدادی طاقتیں دنیا پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور خام مال کے ذخائر کو جو خاص طور پر مشرق میں موجود تھے اپنی ذاتی جائیداد بنا لینے پر کمربستہ تھیں۔ اوروں نے بھی یہ سب دیکھا اور مخدوم نے بھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ لکھتے ہیں:

''جب شعور نے انگڑائی لی تو مخدوم نے دیکھا کہ ان کا محبوب ، مشرق ، مغربی چیلوں کا لقمہ ہے۔ ایک مسلسل رات ایک بھٹکتی ہوئی روح ہے۔ ایک مرگِ بے قیامت ہے۔''

اور اب ملاحظہ فرمائیے ، مخدوم کی نظم ''مشرق'' کے یہ اشعار۔

جہل ، فاقہ ، بھیک ، بیماری ، نجاست کا مکاں

زندگانی ، تازگی ، عقل و فراست کا مساں
وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اُس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ
ایک ننگی نعش بے گوروکفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ ، خون میں لتھڑی ہوئی

یہ تو مشرق سے مخدوم کی جذباتی وابستگی کا اظہار تھا لیکن اس سے ہٹ کر بھی مخدوم کے کلام میں انسان دوستی کی جھلکیاں ملتی ہیں جابر طاقتوں کی ریشہ دوانیوں ، مجرمانہ حملوں اور غاصبانہ قبضوں کے خلاف مخدوم نے آواز بلند کی ہے۔ وہ شمشیر برہنہ ہوجاتے ہیں جیسے اپنے احساسات پر گرفت نہ رکھتے ہوں۔ اُن کی روح کے اندر خیالات کچھ ایسے متلاطم ہوتے ہیں کہ جذبات کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا۔ حبشہ پر مسولینی کے حملے سے متاثر ہوکر مخدوم نے نظم ''جنگ'' کہی لیکن یہ نظم صرف حبشہ تک محدود نہیں رہتی اس کا کینویس کشادہ اور کشادہ ہوجاتا ہے۔ ایسے کئی حبشہ، کئی مسولینی۔ اس وقت کے نہیں آج تک کے بھی۔ نظم ''جنگ'' کے چند اشعار سماعت فرمائیں۔

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹم ٹمارہی ہے یہ پھر شمعِ زندگی؟
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثارِ بیوگی؟

امن و اماں کی نبض چھٹی جارہی ہے کیوں؟
بالیں زیست آج اجل گا رہی ہے کیوں؟
خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی
او آفتابِ رحمتِ دوراں طلوع ہو
او انجمِ حمیت یزداں طلوع ہو

بقول سبط حسن ''غالباً یہ تمھاری (یعنی مخدوم کی) پہلی سیاسی نظم تھی اور فاشزم کے خلاف اردو شاعری کی پہلی صدائے احتجاج۔''

اور حبشہ ہی کیا دنیا میں جب بھی اور جہاں بھی ظالموں نے خون کی ندیاں بہائیں، مزدوروں اور محنت کشوں کا گلا گھونٹنے اور ان کے ارمانوں اور آرزوؤں کو قتل کرنا چاہا، انسان کی بنیادی آزادی کے حقوق تلف کیے۔ اظہار خیال کی آزادی پر قدغن لگائے اور جھوٹی قسموں کو ایمان بنانے کی سعی کی، مخدوم نے اُن کے خلاف قلم اُٹھایا۔ چناں چہ ادھر مالابار کے چار کمیونسٹ کسان جنھیں اپریل 1943ء میں پھانسی دی گئی کے بارے میں نظم ''جانبازانِ کیوّر'' لومبا کے قتل پر ''چپ نہ رہو'' ویت نام کے پس منظر میں ''دُرّۂ موت'' دوسری جنگ عظیم کے سامراجی دور میں لکھی گئی ''زلفِ چلیپا اور مارٹن لوتھر کنگ کے بارے میں اُن کی منظومات ..... مخدوم کے باغیانہ اور انقلابی جذبات اور احساسات کی کوئی حد نہیں، کوئی نہایت نہیں۔ شاعر جب محسوس کرتا ہے کہ استبدادی اور قہار طاقتیں دنیا کے امن وسکون کو درہم و برہم بلکہ دنیا ہی کو نیست و نابود کرنے کی خواہاں ہیں تو اس کے دل میں ان طاقتوں کے خلاف نفرتِ سیل بے اماں کا روپ دھار لیتی ہے۔ وہ جب

محسوس کرتا ہے کہ ..... طاقتیں اپنے حدود سے تجاوز کر چکی ہیں ان کی چیرہ دستیوں کی کوئی حد نہیں تو وہ دوٹوک انداز میں کام و دہن کی پوری تلخی کے ساتھ کہہ اٹھتا ہے

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کر دیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں
ظلمتِ کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگِ خونخوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمنِ جاں کو نگہباں نہیں کہتے ہیں
جاگ اُٹھنے کو ہے اب خوں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرے کا تبسّم دیکھو

اور یہ کہتے ہوئے کہ

بھون دو قصر کو گرگُن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

شاعر کہہ اُٹھتا ہے۔

زلزلو آؤ ' دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ ' گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ ' جہنم کی ہواؤ آؤ

آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

(نظم ''موت کا گیت'')

''اندھیرا''، ''دھواں''، ''جہانِ نو''، ''قمر''، ''روحِ مغفور'' اور ''گھر'' جیسی نظمیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ مخدومؔ کے ہم عصروں جوشؔ' نیاز حیدر' فیضؔ اور وامق جونپوری کے ہاں بھی ایسی نظمیں ملتی ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جنھوں نے اس دور کے انقلابی رجحانات سے حسب توفیق فیض اُٹھایا۔ کسی کے ہاں گھن گرج ہے کسی نے ایمائیت سے کام لیا ہے۔ کسی نے صحافتی پیرایہ اختیار کیا اور کسی کے ہاں نعرہ بازی ہے، جوشؔ تو کہتے ہی ہیں میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب! لیکن مخدوم کے لہجہ میں کہیں کہیں تلخی و تندی سے قطع نظر کر لیں تو اُن کے ہاں بالعموم خنکی اور دھیما پن ملے گا۔ فیض کی طرح مخدوم بھی اپنی بات فنی، ادبی اور تہذیبی اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہتے ہیں جیسے شاعر ضبط و احتیاط کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ یہ چیز مخدوم کے کلام میں تاثر کو فزوں کر دیتی ہے۔

دوسری عالم گیر جنگ کے پس منظر میں ہمارے کئی شاعروں نے نظمیں لکھیں۔ یہ جنگ کن کے درمیان ہوئی اور کیوں سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس میں نوعِ انسانی کی جو تباہی ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ ہٹلری ذہنیت نے دنیا کو تباہ و برباد کر دیا۔ صرف علاقے، عمارات اور مادّی اثاثے ہی تباہ نہیں ہوئے، تہذیب و تمدن کے خزینے ہمارے علمی و ادبی ورثے اور ہماری اخلاقی اقدار بھی تہس نہس ہو گئیں۔ بعد ازاں انسانیت کو کیا ملا؟ ویرانیاں' سناٹے، یتیمی، بیوگی، گرانی، افلاس، بھوک، بے کاری، بے زری، ناداری اور زخم زخم زندگی۔ مخدوم نے دوسری عالمی جنگ کے سامراجی دور میں لکھی گئی اپنی نظم میں نہایت درد

ناک لہجہ میں اس صورتِ حال کی عمدہ پیمانے پر عکس کشی کی ہے۔ یہاں انقلابی لئے تیز ہو جاتی ہے ''سپاہی'' کا پہلا بند ہے

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے
کون دکھیا ہے جو گا رہی ہے
بھوکے بچوں کو بہلا رہی ہے
لاش جلنے کی بُو آ رہی ہے
زندگی ہے کہ چلّا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

لیکن یہ نظم بھرپور رجائی انداز میں ختم ہوتی ہے۔ شاعر، انقلاب کی آمد آمد کی نوید دیتا ہے۔ تین بندوں پر مشتمل اس نظم کا آخری بند ہے۔

گر رہا ہے سیاہی کا ڈیرا
ہو رہا ہے مری جاں سویرا
او وطن چھوڑ کر جانے والے
کُھل گیا انقلابی پھریرا
جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جا رہا ہے

مخدوم کی دو نظمیں ''آزادیٔ وطن'' اور ''جنگِ آزادی، اُن کے باغیانہ مزاج، ان کی

انقلابی نہاد، وطن کی آزادی کے لیے اُن کے جذبہ و شوق، دہقانوں سے اُن کے احساس یگانگت، نوجوانوں سے آزادیٔ وطن کی جدوجہد کے لیے اُن کی رفاقت اور مجاہدین کے عزم و ہمت کو فروغ دینے کے لیے اُن کے ارادوں کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ یہ دونوں نظمیں کبھی نوجوانوں محنت کشوں اور مزدوروں کو ازبر تھیں۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جلسوں، جلوسوں اور گلی کوچوں میں لوگ ان کو والہانہ انداز میں گاتے پھرتے تھے۔ یہ نظمیں آزادی کے لیے اہلِ وطن کے جذبات اور شاعر کے اخلاق کی آئینہ دار ہیں۔ یہ نظمیں ایسی ہیں کہ انھیں مکمل طور پر نقل کر دیا جائے لیکن یہاں پہلے ''آزادیٔ وطن'' کا پہلا بند درج کرتا ہوں۔

کہو ہندوستان کی جے کہو ہندوستان کی جے
قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگین گلستان کی
قسم ہے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں
یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے
روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی
وطن کی شمع آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی
کہو ہندوستان کی جے کہو ہندوستان کی جے

نظم ''جنگِ آزادی'' کا کینویس اور کشادہ ہے۔ یہاں انقلاب کا تصور واضح ہے کہ انقلاب کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ اقبال نے ایسے ہی کسی موقع پر آرزو کی تھی۔

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دمِ نیم سوز کو طائرکِ بہار کر

اقبال طائرکِ بہار ہی ہوئے۔ مخدوم نے آزادی کے گیت گائے، آزادی دیکھی۔ یہاں صرف ہم ہند کے رہنے والے نہیں سارا سنسار آزادی کا خواہاں ہے خواہ وہ افرنگی ہو کہ امریکی، چینی ہو کہ روسی ایک پرچم تلے جمع ہو جاتے ہیں۔ جذبات کی روانی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، گویا سینۂ شمشیر سے باہر ہو دمِ شمشیر کا۔ جذبات ایک سیلِ رواں کی طرح سامنے آتے ہیں جیسے اِدھر اُدھر نہیں سارے شش جہت آزادی کے جذبے سے سرشار ہوں کہیں کوئی فرد، کوئی مادّی پیکر نہ ہو جذبات ہی جذبات ہوں آزادی کے جذبات، انقلاب کے جذبات، خون کھولانے والے جذبات، دلوں کی دھڑکنوں کو شدید اور تیز تر کر دینے والے جذبات، جرأت و ہمت اور ولولوں کو مہمیز لگانے والے جذبات جیسے آتش فشاں پہاڑوں سے لاوا اُبل رہا ہو۔ مخدوم کی یہ نظم ہماری آزادی کی جدوجہد کا ایک اہم ورق ہے۔ یہ ایک دو بند ؎

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

ہم ہند کے رہنے والوں کی　　محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی　　دہقانوں کی، مزدوروں کی

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

سارا سنسار ہمارا ہے　　پورب، پچھّم، اُتّر، دکن
ہم افرنگی، ہم امریکی　　ہم چینی جاں بازانِ وطن

ہم سرخ سپاہی، ظلم شکن　　آہن پیکر، فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

آنے والے بندوں میں بھی یہی روانی، یہی ہمک، جذبات کی یہی تیزی و تندی جیسے بڑے بڑے تالابوں کے بند ٹوٹ گئے ہوں۔ مخدوم کے انقلابی رجحانات کی عکاسی اُن کی نظم ''استالن'' سے بھی ہوتی ہے۔ آج جو بھی صورتِ حال ہو اس سے قطع نظر کبھی استالن کا جو موقف اور امیج تھا اس سے انکار نہیں۔ مخدوم نے کہنے کو قازقستان کے نوے سالہ بوڑھے تاتاری شاعر جمبول جابر کی نظم کا آزاد ترجمہ کیا ہے لیکن اس سے مخدوم کی استالن سے عقیدت ہی مترشح نہیں ہوتی اُن کی انقلابی حقیقت پسندی بھی ابھر آتی ہے۔ یہ چند مصرعے:

کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالہ کر دوں
کیا مجاہد نہ بنوں؟
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی
میرے پیارے، مرے فردوس بدن کی خاطر

اور پھر نظم ''چاند تاروں کا بن'' ہے یہاں روانی کی وہ کیفیت نہیں۔ ضبط و قرار ہے، احتیاط ہے، ٹھہراؤ ہے وہ بند ٹوٹنے والی کیفیت نہیں۔ دلِ ستم زدہ کو تھام تھام لینے والا رویہ ہے۔ لہجہ میں خنکی ہے، دھیما پن ہے و نیز جیسے کہ عنوان سے بھی مترشح ہے اس نظم میں رومانیت بھی در آئی ہے اس نظم کی عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا، سب اپنی مثال آپ ہے۔ نظم کے ابتدائی مصرعے ہیں ؎

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر

تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدھوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ الم بن گئے

ایک اور بات! ''چاند تاروں کا بن'' پڑھتے ہوئے فیض کی نظم ''صبح آزادی'' ضرور یاد آئے گی۔ فیض نے آزادی کے بعد کی صورتِ حال کو 'یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر' کے اشعاروں میں پیش کیا ہے۔ مخدوم کے مصرعے ہیں:

رات کی تلچھٹیں ہیں، اندھیرا ابھی ہے
صبح کا کچھا جالا، اجالا بھی ہے

مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے باوجود مخدوم کے ہاں رجائیت زیادہ ہے۔ یہاں ان دونوں نظموں کا موازنہ مقصود نہیں، عرض کرنا یہ ہے کہ ہمارے شاعروں کا اظہار

مختلف ہوا ان کے فکر کا پیرایہ لگ بھگ ایک تھا۔

مخدوم کا شعری سرمایہ یوں بھی کم ہے۔ غزلیں اور کم۔ کوئی (۲۱) ہوں گی۔ ان غزلوں میں رومانیت کا عنصر زیادہ ملے گا۔ کہیں کہیں روایتی انداز بھی لیکن ان میں باغیانہ اور انقلابی رجحانات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔ کہیں تشبیہ کی صورت میں کہیں استعارات میں کہیں کنایاتی انداز میں اور کہیں اشاریت کا پیرہن لیے ہوئے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اُٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں گُل کو ہم کنار کریں
ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چُپ، سر بہ گریباں ہے جفا آخر شب
کیسے طے ہوگی یہ منزلِ شام غم، کس طرح سے ہو دل کی کہانی رقم
اک ہتھیلی میں دل 'اک ہتھیلی میں جاں، اب کہاں کا یہ سود و زیاں دوستوں
سیاست دلِ آئینہ چور چور تو تھی
سیاست دل آہنگراں بھی ٹوٹی ہے

ایک اور بات عرض کروں۔ مخدوم کی شاعری کا بڑا حصہ ہے بھی انقلابی رجحانات کا حامل، لیکن اُن کی رومانی شاعری کا ایک حصہ بھی رومانی انقلابی عناصر کا حامل ہے۔ روایتی و گھسا پٹا 'چلتا چلاتا اور یوں ہی سا رومانی انداز نہیں ان کی رومانیت انقلابی رجحان رکھتی ہے لیکن اس سے پہلے، اردو شاعری کے ازل سے رومانی شاعری ہے لیکن ایسے نہیں مخدوم کا رویہ کچھ اور ہے۔ انھوں نے رومانیت میں بھی انقلابی روح پھونک دی۔ یہ اشعار دیکھیے۔ یہ سیدھے سادے رواروی والے رومانی اشعار نہیں ان میں انقلابی رجحانات تھرکتے اور مہکتے ملتے ہیں۔ نظم ''طور'' کا یہ بند۔

دلوں میں اژدہامِ آرزو ، لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دمِ اُلفت کا بھرتے تھے
نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

انسان ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے جذبات واحساسات اس کے افکار وخیالات، اس کے سلام و پیام ختم نہیں ہوتے۔ فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا۔ ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے کی طرح موت جذبات اور احساسات پر فتح نہیں پاسکی ہے، فتح نہیں پا سکے گی۔ انسان کے وجود کے مرکز سے دور رہے گی۔ مخدوم کے افکار وخیالات پر بھی پہرہ بٹھانا ممکن نہیں۔ مادّی اور جسمانی وجود کا انجام جو ہونا تھا، وہ ہوتا ہے، وہ ہوا لیکن افکار وخیالات ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ مخدوم کے خیالات بھی۔ آزادی کی جدوجہد ختم ہو چکی۔ ہم نے آزادی حاصل کر لی لیکن کئی معاملوں میں پوری طرح آیا ہم آزاد ہیں؟ میں کسی مسئلہ یا معاملہ پر خصوصی طور پر عرض کرنا نہیں چاہتا لیکن سامنے کا ابھی ابھی کا مسئلہ ہے اور کچھ نہیں آپ اہلِ نظر بتائیں۔ بین الاقوامی جوہری توانائی ادارہ کے ویانا اجلاس میں ایران کے خلاف ہمارا ووٹ اور ہند۔ امریکی جوہری مسئلہ پر ہمارا موقف۔ ہمارے بارے میں اندرون اور بیرونِ ملک کیا تاثر دیتے ہیں۔ ہمارا آزادنہ موقف سوالیہ نشان تو نہیں بن جاتا؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم کو اپنا سفر طے کرنا ہے ابھی منزل پانی ہے۔ ہمارے سب کے، مخدومؔ کے خوابوں کی تعبیر ابھی ڈھونڈنی ہے!

☆☆☆

ڈاکٹر عقیل ہاشمی
سابق صدر شعبہ اُردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

یارِ غم گسار کی بات
(مخدومؔ محی الدین شخص اور شاعری)

تاریخ کا ہر دور، ہر عہد اس میں رہنے بسنے والوں کے لیے دعوت غور وفکر دیتا ہے آج جب کہ ہر راگ نیا، ہر لَے نئی ہر ادا نرالی ہر آواز جُدا، فرسودہ اور کہنہ روایات کی آہنی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں زمانے کا اقتضاء ہی بدل چکا ہے اس آئی ٹی' خلائی مہمات اور اقتدار کے دور نے چاند تاروں پر انسانی عقل وفراست اس کی حکومت کی کمندیں پھینکیں، ان کو مسخر کر لیا اور اپنی بساط سے بھی سوا کرنے لگا ہے لیکن زندگی کی مختلف جہتوں اس کی الجھنوں اور مسائل سے گلوخلاصی نہ پا سکا۔ اس طوفانی کشمکش کے چنگل سے باہر نہ نکل سکا جس نے اس کو تسکین آسودگی لذت اندوزی سے دور رکھا تاہم حیات وممات کی تلخیوں سے نبرد آزما ہونے کے حوصلے سے آگاہ و باخبر ادیب وشاعر فن کاروں نے زندگی کی تمام کیفیات تمام تر تقاضوں کو ہر، ہر زاویے سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے زیر نگیں کر لیا اور بہ عنوان ادب شاعری ونثر نگاری انسان کو جینے کا سلیقہ وشعار بخشا خصوصیت سے شاعری کو باب حسن وعشق، گل وبلبل، بادہ و

ساغر، شمع و پروانہ ہجر و وصال اور ایسے ہی جذبات کے ساتھ ساتھ مقفّٰی و مسجع عبارت آرائی مبالغہ طمطراقی کی دنیا سے نکال کر اصل حیات سے دوچار کیا بلکہ زیست کی سب سے بڑی مجتہد بن گئی آج کا شاعر نبّاض وقت' دیدہ بے دار' حساس' غم وخوشی کا واقف کار اور تضاد فکری و نظری سے آگاہ، اپنے مشاہدات کی سچائی کا نقیب، جذبات و تجربات کا عکاس اس کا ترجمان ہے وہ اپنی تخلیق کی صورت سے اطراف و اکناف ہی نہیں اپنے اندر بھی جھانکتا ہے، ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے، شگفتگی تلخی آسودگی شوریدگی کا ذمہ دار ہے حالات واقعات کا آئینہ دکھاتا ہے یوں تو اس کو ہر علم سے سروکار ہے ہر فن سے ربط و تعلق ہر حادثہ ہر واقعہ سے دل چسپی رکھتا ہے۔ ہر کارِ حیات میں پوشیدہ و پنہاں نشاط و رنج کی طلب سے علاقہ اس کا وصف مزید ہے۔ اب آپ اسے کسی اور حسین اصطلاح یا معنی خیز لفظ سے وابستہ کرلیں بہرصورت یہ ماننا پڑے گا کہ الفاظ کا یہ جادوگر محض لفاظی نہیں کرتا مرصع سازی کے جوہر نہیں دکھاتا بہترین خیالات کی ترسیل سے ذہن و دل کو راست متاثر کرتا ہے بلکہ محض حسنِ طریق و شائستگی خیال سے ایسے شعر کہتا ہے کہ ایک عالم اس کی طباعی فہم و تدبر پر عش عش کرے۔ شعر کے ذریعے وہ ایک ایسا ساز چھیڑتا ہے جس میں نفسِ انسانی کو مرتعش کرنے کے لیے ہر تار موجود ہے، اور اس کو بجانے والا وہ مغنی ہے جو صدیوں سے انسانی قلوب کی تمناؤں آرزوؤں، حسرتوں، شادمانیوں، محرومیوں کا محرم ہونے کے سبب محترم و محبوب رہا ہے ایسے ہی مرد آگاہ شاعروں میں ایک شاعر تھا نبض شناسِ عصر، مخدومؔ محی الدین۔

مخدومؔ محی الدین ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم گیر سطح کا وہ ہر دل عزیز انقلابی شاعر ہے جس نے اپنی انفرادیت اور اختصاص کو ابتداء ہی سے بنائے رکھا، مخدومؔ کی شاعری کا تاثر، انوکھا دل چسپ جدت و ندرت سے مملو، غیر معمولی جذباتی ہے مخدومؔ دکن کا وہ پہلا شاعر ہے

جس نے روایتی بندھنوں کو توڑ دیا اور ایک الگ راہ اپنائی اس نئی ڈگر سے اپنی نغمگی کا آغاز کیا جس میں شعریت کا لوچ زندگی کا درد غربت و امارت کا تفاوت صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ اسی کے ذریعے اسے شہرت دوام ملی یہ سعی و کاوش خود اس کے ہم عصروں کے لیے بھی مقام حیرت کا موجب بنی اس نے حیات امروز کی دھڑکنوں کو اپنے بربط دل پر مضراب کی صورت میں محسوس کیا، مخدومؔ نے شاعری کے اُس پہلو یعنی تفریح و تفنن خوش طبعی کو مسائل حیات کی آبیاری سے بدل دیا، انھوں نے زمانے کے بدلتے رجحانات کو نظر میں رکھتے ہوے نئے نئے تقاضوں کے آئینہ میں اپنے فطری جوش و خروش کو مختلف انداز و طریق سے اُجاگر کیا ایک حسّاس بے دار مغز دوررس نتائج کے حامل انسان ہونے کے ناطے وہ مختلف حیثیتوں میں ایک خاص شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی مقناطیسی طبعیت کا پَرتو ہر جگہ ہر مقام پر نمایاں و ممتاز رہا۔ وہ کبھی کالج کے لکچرر کبھی ٹریڈ یونین کے لیڈر کبھی مجاہد آزادی کبھی قانون ساز کونسل کے ممبر ایک جی دار مضبوط صاحب عزم قائد تحریک مخلص دوست کے علاوہ ایک مزاج دانِ رنگ و آہنگ شاعر بھی تھے اور یہ تمام ہمہ جہتی ہر سطح ذہن کو متاثر کرتی تھی۔

ایک جھونکا ترے پہلو کا مہکتی ہوئی یاد ایک لمحہ تری دلداری کا کیا کیا نہ بنا

مخدومؔ محی الدین کی شاعری کا ابتدائی دور روایتوں کا پابند اقدار و اصولوں کا شائق رنگینیٔ مزاج کا خوگر پستی و بلندی نشیب و فراز سرد و گرم سے عبارت ہے لیکن یہ طلسم لفظ و معنی بہت جلد ٹوٹ گیا کہنگی و فرسودہ خیالی کا جادو، حقائق کی روشنی ظلمت کی پردہ داری سے ختم ہوا۔ زمانے میں نظریاتی تصادم طبقاتی کشمکش رجعت پسندی اشتراکیت سامراجیت عامرانہ طور طریق کے بت نہ جانے کتنے صنم خانوں میں سجائے گئے اور ان کی پرستش ہونے لگی تھی۔ ایسے میں بھلا مخدومؔ کی سیمابی فطرت کیسے خاموش رہتی مخدومؔ آزادی کے ان متوالوں کی آواز

میں آواز ملانے لگے اُن کے شانہ بہ شانہ چلنے کو اپنا نصب العین بنالیا جنھوں نے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا تھا اپنی اس شاعری کی ابتداء انھوں نے ''اندھیرا'' سے کی۔ بقول علی سردار جعفری ''اندھیرا'' مخدومؔ کی شاعری کا صحیح موڑ ہے۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم　　صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

اسی کیف و سرور اسی ترنگ میں مخدومؔ نے جنگ آزادی، زلف چلیپا، سپاہی جیسی نظمیں لکھیں۔ نظم سپاہی کے بارے میں عام خیال ہے کہ اس میں افسردگی افتادگی کے سوا کچھ نہیں مگر یہ سچ نہیں شاعر ''سرخ سویرا'' نے جس حوصلہ وعزم نیز غم واندوہ سے اس کی عکاسی کی ہے وہ بجائے خود انوکھی وغیر معمولی ہے۔

؎ لاش جلنے کی بو آرہی ہے　　زندگی ہے کہ چلّا رہی ہے
کتنے سہمے ہوئے ہیں نظارے　　کیسے ڈر، ڈر کے ملتے ہیں تارے
کیا جوانی کا خوں ہورہا ہے　　سرخ ہیں آنچلوں کے کنارے
جانے والے سپاہی سے پوچھو وہ کہاں جارہا ہے

شاعر کا تلخ وتند، لب ولہجہ، اداسی حرماں نصیبی سے کہیں زیادہ جانکاہ منظر دل دوز واقعہ جذباتِ شدید سے آگاہ کرتا ہے الفاظ کا ادراک کہانت اور روایت سے دور سرگذشتِ آدم اس طرح بیان ہورہی ہے کہ شاعری کی تمام تر فوقیت اس کی لفظی ومعنوی دل کشی ایک نقطہ میں سمٹ گئی یقیناً یہ انسانیت کا وہ المیہ ہے اس سرمایہ کو بیش بہا کہا جائے تو غلط نہیں۔ مخدومؔ کا یہ طرز فکر روش، انداز بیان زیادہ پسندیدہ نہیں رہا لیکن ان کی شاعری کے یہ خدوخال رفتہ رفتہ زمانے کے واقعات سے ہم آہنگ ہونے لگے اور پھر جو مقبولیت مخدومؔ کے حصہ میں آئی وہ

ان کے ہم عصروں کو شاذ ہی حاصل ہوسکی۔ ''سرخ سویرا'' کی اشاعت کے بعد مخدومؔ کا شمار نئے ادب کے معماروں میں کیا جانے لگا انھوں نے بہ بانگ دہل یہ اعلان کیا کہ ''عوام کا احترام کرو'' ظالم اور صاحب اقتدار حکمراں طبقے نے انھیں اس سلسلے میں سب وستم سے دوچار کیا۔

مخدومؔ محی الدین فطرتاً ایک مہم جو فعّال باصلاحیت پرجوش انسان تھے انھوں نے حیدرآباد کے نوجواں طبقے کو جدید ادب کے تقاضوں سے نہ صرف روشناس کیا بلکہ انقلاب پر اکسایا انھوں نے شعروسخن ہی نہیں بلکہ محنت کش افراد کی بھی نمائندگی کی شاعروں کو تصنع بناوٹ ریاکاری مشکل پسندی فصیح وبلیغ مغلق استعاراتی زبان وبیان کے استعمال سے اجتناب کرنے کا مشورہ دیا ان کا سیدھا سادہ طرز اظہار عام فہم طور طریقہ عوام پسند ہوگیا۔ مخدومؔ کا یہ رنگ و آہنگ بربطی لہجہ غنائی کیفیت موسیقیت دلوں کو چھو لینے والا منہاج بن گیا یہ اچھوتا اور شان دار ڈھنگ اسلوب ان کے کلام میں ابتداء تا انتہاء محیط دکھائی دیتا ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے دیگر شاعروں جیسے مجازؔ، جذبیؔ، جعفریؔ، فیضؔ سے کچھ آگے ہی دکھائی دیتے ہیں ان کے لہجے میں دردمندی رواداری اپنایت جھلکتی ہے۔ اشتراکی نظام سے وابستگی کے بعد مخدومؔ کا شعری شعور اور وسیع النظر ہوگیا اس کا آفاقی تناظر رومانیت کے مزاج ومرتبہ سے نئی آگاہی نئی زندگی سے واقفیت دلاتا ہے۔

جہل فاقہ بھوک بیماری نجاست کا مکاں　　زندگی کی تازگی عقل وفراست کا مساں

اس جوش وولولے سے وہ ایک نئی سحر نئی امنگ نئے ارادے اور نئے عزم کا اظہار کرتے ہیں۔

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا　　اک نئی دنیا ، نیا آدم بنایا جائے گا

پھر ان کا یہ پیغام آج بھی اپنی مکمل معنویت منفرد فکر قوت عمل کا آئینہ دار ہے کہ انسانیت کے اس عظیم کاروانِ تگ ودو میں اتحاد واعتماد ہی سب سے بڑی طاقت ہے جس کے ذریعے وقت کے دھارے بدلے جاسکتے ہیں۔ مخدومؔ کا یہ شعر اس خیال کی تفسیر سے جدا نہیں بلکہ ضرب المثل بن گیا۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو　　چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اس انقلابی صدائے لازوال کے ساتھ وہ غریبوں اور محنت کشوں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

یہ کس غریب کے سینے سے ہو کر اٹھتی ہے　　لرز رہے ہیں محل ، تھرتھرا رہا ہے قمر

مخدومؔ جاگیردارانہ نظام یا سرمایہ پرستی کے سخت مخالف تھے وہ اس طرز حیات پر بھرپور وار کرتے ہیں۔

آپ تن آسان راج دلارے　　میں وحشی طوفان بدوش
میری دنیا جہدِ مسلسل!　　آپ کی دنیا سیل خموش

مخدومؔ نے اپنی سحر انگیز بے مثال شاعرانہ خلاّقی انسان دوستی سے جذبات انسانی کی شرح کی ہے چناں چہ خود انھوں نے ایک جگہ لکھا۔

''شاعر اپنے گردوپیش کے خارجی عالم اور دل کے اندر کی دنیا میں مسلسل کشمکش اور تضاد پاتا ہے یہی تضاد تخلیق کی قوت محرکہ بن جاتا ہے۔ شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو،

روحانی کرب واضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا ہے اور شعر میں ڈھالتا ہے اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین وطمانیت کے مرکب میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ شاعر بحیثیت ایک فردِ معاشرہ حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے پھر وہ دل کی جذباتی خلوتوں میں چلا جاتا ہے۔ روحانی کرب واضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے۔ شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوعِ انسانی سے قریب تر ہو کر ہم کلام ہو باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب ''انا'' اور انفرادیت سے تعبیر کرتا ہے۔ شعر میں ہم ماوراء کی حدوں کو چھوتے ہیں مگر شعر سماج سے ماوراء نہیں ہوتا۔''

(ماخوذ از گل تر پیش لفظ)

اس اقتباس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ مخدومؔ کے کلام میں گہرائی گیرائی بہ درجۂ اُتّم موجود ہے لیکن ہمارے بعض اہل علم مخدومؔ کی شاعری کے اسی ایک پہلو پر زور دیتے ہیں یا پھر ان کے کلام کو محض انقلاب آفریں شاعری کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جب کہ ان کے ہاں جمالیاتی بانکپن سوز وگداز نازک جذبات حسّاس دل کی کیفیات کی فراوانی بھی ملے گی۔ ان کے مزاج میں جہاں سیمابی زیر و بم ہے محبت چاہت کی دلدادگی خوب صورتی صاف پڑھی جاسکتی ہے۔ انقلابی وصف کے ساتھ ساتھ شاعرانہ رنگ وآہنگ دل کشی رعنائی لفظیات کی صلابت سادگی متاثر کن ہے اور یہی مخدومؔ کی شاعری کا خاصہ بھی ہے۔ شاعری پابند ہو یا آزاد ان کا لب ولہجہ ہمیشہ چونکا دینے والا بلکہ قلب وذہن پر چھا جانے والا ہوتا ان کی نظمیں

''چاند تاروں کا بن''، ''دھنک''، ''وصال'' اور ''لختِ جگر'' اپنی تاثیر و موسیقیت موضوع کی وسعت کے علاوہ اختصار و جامعیت کا ایک وقار و تمکنت بنائے ہوئے ہے۔ ان نظموں سے قطع نظر مخدومؔ کی وہ شاعری جو جمالیاتی جولانیوں سے بھرپور بربطی وغنائی لحاظ سے معمور ہے۔ اہل ذوق وشوق کے لیے نعمت سے جدا نہیں گویا تسکین آسودگی لذت درد و کسک کا ادراک مائل بہ التفات ہے۔

آ گئی تھی دل مضطر میں شکیبائی سی　　بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی
رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے　　سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز　　کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم

مخدومؔ کی شاعری میں محبت کا پاکیزہ جذبہ اور اس کا تصور صاف جھلکتا ہے وہ کبھی اپنے محبوب سے یہ نہیں کہتے کہ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' بلکہ وہ اپنے آپ کو محبوب سے جدا نہیں پاتے ان کا یہ انداز فکر اس کا بے ساختہ پن دیکھیے۔

وہ خمِ گردن و دست ناز وہ ان کا کلام　　ابروؤں کا تکلّم وہ نگاہوں کا پیام
بولتی آنکھوں کا اس گل رنگ کے عارض کا حال　　مسکراتا سا تصور گنگناتا سا خیال

اور مخدومؔ اسی فضاء میں کھوئے جاتے ہیں اُن کی اس شاعری کے بارے میں ایک نقاد کا کہنا ہے۔

''مخدوم کے ہاں یاد ماضی کی تلخی نہیں جھلکتی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اُن محبت کی تحریکوں سے خوش ہے مطمئن زندگی کی ان وارداتوں سے نفرت کرتا ہے اور نہ شرمندہ ہے ان کو یاد کر کے لطف اندوز ہوتا ہے وہ اکثر اپنے محبوب سے باتیں کرتا ہے گویا وہ اس کے

روبرو ہو۔''

چاروں طرف پھیلی ہوئی چاندنی ہی چاندنی　　جیسے وہ خود ساتھ ہیں ان کی جوانی ساتھ ہے

مخدومؔ نے شاعری کے تلازموں کو بھی بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے جیسے ہجر و فراق، ایسے لگتا ہے کہ وہ اس کیفیت سے سرشار ہیں وہ جدائی محسوس کرتے ہیں درد والم سے آگاہ و باخبر ہیں اس کیفیت کی ادائیگی پر نظر ڈالیے۔

نہ اب وہ کھیت باقی ہیں نہ وہ آب رواں باقی　　مگر اس عیشِ رفتہ کا ہے اک دُھندلا نشاں باقی

اور جب جی بھر آتا ہے یاد کے کچوکے اندوہ گیں کر جاتے ہیں تو وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلیاں دیتے ہیں۔

یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی
دل میں اژدھام آرزو لب بند رہتے تھے
نظر سے گفتگو ہوتی تھی دم الفت کا بھرتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

عشق و محبت کا یہ انوکھا تاثر، نرالی حالت، قاضی عبدالغفار نے یہ شعر کسی مشاعرہ میں سنا تو کہا ''خدا اس نئی پود کو پروان چڑھائے جو خدا کے سامنے پیار کرنے سے نہیں جھجکتی اور جس کا خدا بھی اتنا ہی مشفق و مہربان ہے کہ محبت کے اس مظاہرہ پر خوش ہوتا ہے۔''

عبارت مختصر! مخدومؔ کی شخصیت اور شاعری نئی جہت نئی روشنی نئی آگہی نئی حیات سے عبارت ہے ان کے خیالات تجربات مشاہدات فن کی پختگی کے ہمراہ دل و نگاہ کو لطف و نشاط سے ہم کنار کرتی ہے وہ شاعری میں تہذیب نفس اور اخلاص بے پایاں کو سمونے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں ان کے ہاں تصنّع بناوٹ، خوشامد، تملق نام کی کوئی شئے نظر نہیں آتی وہ آدمی

کو بربریت، انسانیت سوز حرکات، حرص و آز کے برخلاف محبت، پاس داری، رواداری، یک جہتی کا درس دیتے ہیں۔ شاعری کی وساطت سے مخدومؔ نے ایک پورے عہد کو متاثر کیا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے تین نسلوں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ اپنے بزرگوں (شعراء، ادباء) اپنے دور کے افراد اور اپنی آئندہ نسل کو راست محنت و محبت سے آشنا کردیا۔ اور ایک خوش آئند مستقبل کا آرزومند بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ روح کی نشاط انگیز رعنائیاں کیف و سرور کی پُروائیاں واقعات اور حادثات کی سچائیاں مخدومؔ کے کلام میں قدم قدم پر اپنا اثر و نفوذ بنائے رکھتی ہے اور شاید خود مخدومؔ کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ:۔

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے　　الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات

☆☆☆

پروفیسر بیگ احساس
صدر شعبۂ اُردو، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی

مخدوم کی شخصیت کے چند پہلو

مخدوم محی الدین کا نام ان کے جدّ اعلیٰ حضرت شیخ ابوسعید الخذری بن مالک کے نام پر رکھا گیا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے۔ آپ کے والد جنگ احد میں شہید ہوگئے تھے۔ انھوں نے کوئی اثاثہ نہیں چھوڑا تھا گزر بسر کا کوئی ذریعہ نہیں تھا نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی۔[1]

پتہ نہیں یہ نام کی تاثیر تھی یا تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ مخدومؔ کے والد محمد غوث محی الدین کے انتقال کے وقت مخدومؔ کی عمر پانچ برس دو ماہ تھی۔ مخدومؔ کی والدہ کا عقد چچا زاد بھائی عظیم الدین سے کردیا گیا۔ مخدومؔ سے یہ بات بتائی نہیں گئی۔ باپ کی محبت کو ان کے چچا بشیر الدین نے پورا کیا لیکن وہ ماں کی محبت سے محروم رہے۔ بچپن بلکہ جوانی بھی عسرت میں بسر کی۔ مخدومؔ نے امیر عارفی کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا:

> ''میں نے مولسری کے بیجوں پر ختم خواجگان' مولود شریف پڑھنے سے لے کر مسجد کی جاروب کشی کی اور اذاں تک دی۔ مسجد میں کنویں سے پانی نکالتا۔ ہر جمعہ کو سر منڈواتا، سخت گرم پانی سے نہاتا اور روزانہ کے معمول میں فرض و سنت اور نوافل کے علاوہ اشراق

اور چاشت کی نمازیں پڑھتا۔''[۲]

بچپن کے مذہبی ماحول نے ان کے اندر ایک شرافت پیدا کر دی تھی۔ صبر و قناعت ان کا سب سے بڑا وصف تھا۔ ان میں بلا کی خودداری تھی۔ مرزا ظفر الحسن لکھتے ہیں:

ایک دفعہ (مخدوم) فلاش تھا۔ مسلسل دو روز سے کچھ کھایا نہ تھا۔ یوں ہی رشتے کے چچا سمیع الدین کے گھر گیا، جہاں دختر نیک اختر نے مخدوم کو نحیف و نزار پایا۔ کھانے کے لیے پوچھا تو وہ دو دن کا فاقہ زدہ کس برتے پر انکار کرتا۔ اس لڑکی نے جلدی سے دو روٹیاں پکائیں۔ دسترخوان بچھایا اور کھانا پیش کیا۔ بعد کو وہی دختر نیک اختر جس کا نام رابعہ ہے مخدوم کی رفیقہ حیات ہوئی۔ (عمر گذشتہ کی کتاب :ص۔۵۶)

اس واقعے کو مغنی تبسّم نے اس طرح سے لکھا ہے:

ایک بار یوں ہوا کہ دو دن تک انھوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ اپنے ایک رشتہ دار سید حسین سے ملاقات کے لیے گئے وہاں سید حسین کے بڑے بھائی انوار الدین کی بیٹی نے کھانے کے لیے پوچھا یہ انکار نہ کر سکے۔ اس نے جلدی سے روٹیاں پکائیں اور دسترخوان بچھا کر کھانا پیش کیا۔ یہی لڑکی جس کا نام رابعہ تھا مخدوم کی رفیقۂ حیات بنی

(شعر و حکمت: کتاب ۹ دور سوم۔ص ۳۷)

واقعہ وہی ہے صرف چچا کے نام میں اختلاف ہے۔ مغنی تبسّم کا بیان زیادہ تحقیق شدہ معلوم ہوتا ہے۔

مخدومؔ کی احسان مندی کہ انھوں نے ایک طرف تو اس لڑکی کو شریک حیات بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ناراض چچا کی رضامندی کو بھی ضروری سمجھا ہے۔ دوسری طرف چچا نے وسیع القلبی کا مظاہرہ کر کے مخدومؔ کی خواہش کو پورا کیا۔

مخدومؔ کا یہ انتخاب اس قدر صحیح تھا کہ اس خاتون نے مخدومؔ جیسے سیاسی مقاصد کے لیے وقف لیڈر کا صبر و تحمل، ہمت' حوصلے اور استقامت سے ساتھ دیا۔ پروفیسر شفقت رضوی لکھتے ہیں۔

''بی امّاں قابل تعظیم کہ انھوں نے جنگ آزادی میں اپنے بیٹوں کا ساتھ دیا اور چار دیواری سے نکل کر میدان عمل میں آئیں۔ بیگم حسرت موہانی بھی شوہر کے دوش بدوش معرکہ حق و باطل میں شریک رہیں۔ رابعہ مخدوم کا مرتبہ ان سے کم نہیں۔''

(مخدوم محی الدین ترقی پسند شاعر انقلابی رہنما ص:۱۳)

واقعی اس خاتون نے بڑے استقلال کے ساتھ خاندانی ذمہ داریاں خود سنبھالیں ان کے تعاون سے ہی مخدوم یکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ مخدوم اپنی اہلیہ کی بے حد عزت کرتے تھے۔

ماں باپ کی محبتوں سے محرومی طالب علمی کے زمانے کی تنگ دستی کے باوجود ان پر کبھی یاسیت یا قنوطیت غالب نہیں آئی۔ انتقام کا جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ ان میں خوش مزاجی اور خوش مذاقی پیدا ہوئی۔ فقرا بازی، برجستگی، لطیفوں کی ایجاد اور بے ساختگی میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ مخدومؔ نے جامعہ عثمانیہ میں سات سال ایک تیز و طرار، خوش طبع، ہنسوڑ، لطیفے گو اور کھلنڈرے نوجوان کی طرح گزارے۔ کبھی اپنے حالات کا رونا نہیں رویا۔ مخدومؔ نے متوسط

طبقے کی سادگی، انسان دوستی، محبت، صبر وقناعت کو اپنایا۔ لیکن اس طبقے کی بے عملی اور منافقت کو نہیں اپنایا۔ ان کی زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے لیکن ان کا مقصد کبھی حصول زر نہیں رہا۔ دوستوں کی محفلوں میں جو لطیفے ایجاد ہوئے یا فقرے چست ہوئے اگر یک جا کیے جاتے تو ایک ضخیم کتاب ترتیب دی جاسکتی تھی۔ مخدومؔ نے اپنی محرومیوں کو دوستوں کی محفلوں اور محروم انسانوں کی خدمت اور ان کے درد کو سمجھنے میں بھلا دیا۔

مخدوم نے کبھی اپنے اصولوں سے سمجھوتا نہیں کیا۔ مرزا ظفرالحسن لکھتے ہیں:۔

''طالب علمی کے دور کے خاتمے کے بعد بے روزگاری کے عفریت سے پالا پڑا۔ وہاں بھی قابلیت کے مقابلے میں سفارش کا چلن تھا اور مخدوم اس معاملے میں تہی دست تھے۔ وہ خوشامد سے سفارش حاصل کرنے کی بجائے معمولی اور جز وقتی نوکری پر گزارا کرتے۔ ایک بار معتمدی امور اصلاحات میں کلرکی کی۔ ان کے جامعہ کے ساتھی شہاب الدین بھی اسی محکمے میں ملازم تھے۔ محکمہ کے معتمد نواب نفیس یار جنگ تھے۔ بڑے سجیلے، خوب رو، نفاست پسند! شہاب الدین بھی اپنی جگہ نفیس یار جنگ تھے۔ شیروانی نفیس، قمیص، ٹوپی نفیس، جوتا نفیس اور سیکل نفیس مگر مخدوم کا معاملہ بالکل الگ تھا۔ وہ ہمیشہ پھٹیچر الدولہ تھا۔ ٹوپی پر میل، شیروانی کا کالر پھٹا ہوا، کمر بند میں ایک گرہ تو جوتے کی ڈوری میں چار چار۔ قمیص کے بٹن ٹھیک تو آستین کے بٹن ٹوٹے ہوئے۔ کوئی اپنی خو چھوڑے نہ چھوڑے، مخدوم اپنی وضع بدلنے والا نہ تھا۔ ایک کیا بیک وقت کئی عدد یوسف یار جنگ

بھی ہوتے تو مخدوم مخدوم ہی رہتا۔ چناں چہ اس نے نوکری چھوڑی اپنی وضع نہ چھوڑی۔'' (ذکر یار چلے: ص ۱۷۸)

دراصل یہ وضع مخدوم کی مجبوری بھی تھی۔

کالج کے زمانے میں انھوں نے یونی فارم کی گہری نیلی شیروانی سلوائی تھی۔ برسوں انھوں نے اسی شیروانی پر گزارا کیا۔ یہاں تک کہ وہ بدرنگ ہوگئی۔ انھوں نے اسے دھلوانے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ اس شیروانی کا نعم البدل کچھ نہ تھا۔ جب اچھے دن آئے تو وہ زیادہ تر بش شرٹ پینٹ پہننے لگے تھے۔ انھیں ظاہرداری، تصنع، دکھاوا اور نمائش پسندی سے نفرت تھی۔ مخدومؔ کا مزاج ملازمت کا متحمل نہ تھا۔ نہ انھیں نشرگاہ حیدرآباد میں بحیثیت مترجم کام کرنا راس آیا اور نہ ہی وہ سٹی کالج میں بحیثیت مدرس زیادہ دنوں تک کام کرسکے۔

مخدومؔ کمیونسٹ پارٹی کے اہم لیڈر تھے۔ شاہی کے خلاف جدوجہد کے دوران وہ روپوش بھی رہے۔ تلنگانہ تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس ملک کی سیاست کا مقصد دولت وثروت کا حصول ہو۔ مخدومؔ نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ مخدومؔ نے بارہ لاکھ ایکڑ زمین کسانوں میں تقسیم کی۔ اپنے لیے زمین کا معمولی ٹکڑا بھی نہ لیا۔ وہ ہاؤزنگ بورڈ کے رکن تھے۔ دوستوں کو مکان الاٹ کیے لیکن خود کرایہ کے مکانوں میں زندگی گزاری اپنے خاندان کے لیے ایک جھونپڑی بھی نہیں چھوڑی۔ 1952 سے 1969 تک اپوزیشن لیڈر رہے لیکن انھوں نے اصولوں کی خاطر اولاد کے مفاد اور ان کے مستقبل کی بھی پرواہ نہ کی۔ ان کے لیے کوئی بنگلہ تو دور کی بات ہے معمولی مکان کا تک بندوبست نہیں کیا۔ نہ کبھی مخدومؔ کی اہلیہ نے اس کے لیے ضد کی۔ انھوں نے اپنے لڑکے کی ملازمت کے لیے بھی کسی سے سفارش نہیں کی۔

مخدومؔ نے سادہ زندگی بسر کی۔ ضروریات زندگی کو محدود رکھا۔ کبھی کبھار گھر کا سودا

سلف خود لایا کرتے وہ بازار کے داموں سے لے کر دھوبی کے حساب کتاب تک ہر چیز سے واقف ہوتے۔

خدا نے مخدوم کو دکن کی مٹی اور چٹانوں سے بنایا تھا۔ مخدومؔ کا رشتہ یوں تو دنیا بھر کے مظلوم اور محنت کش عوام سے تھا لیکن ان کا ایک مضبوط رشتہ اس سرزمیں سے بھی تھا جس نے انھیں جنم دیا تھا۔ جس کی گود میں پلے بڑھے تھے۔ مخدومؔ نے اپنی دھرتی کے گیت بھی گائے۔ اسے سراہا اس سے بے پناہ محبت کی۔

انھوں نے لکھا:

دشت کی رات میں بارات یہیں سے نکلی
راگ کی رنگ کی برسات یہیں سے نکلی
انقلابات کی ہر بات یہیں سے نکلی
گنگناتی ہوئی ہر رات یہیں سے نکلی

مخدومؔ حیدرآباد کے لیے تھے اور حیدرآباد مخدومؔ کے لیے۔ دکن والوں نے مخدومؔ کو ٹوٹ کر چاہا۔ مخدومؔ نے خوب محبتیں لوٹیں اور لٹائیں۔ مخدومؔ نے محبت کے ساتھ اعتماد بھی حاصل کیا۔ عام مزدوروں سے لے کر لڑکیاں اور ان کے سرپرست تک مخدومؔ پر اعتماد رکھتے تھے۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ لکھتی ہیں:

''کوئی گھر ایسا نہیں جہاں وہ جا نہ سکتا ہو۔ عورتوں میں عورت،
مردوں میں مرد، سیاست دانوں میں اپوزیشن لیڈر اور بچوں میں
سرکس کا مسخرا۔ میں نے بارہا نہایت گھریلو قسم کی عورتوں سے
بگھارے بیگن یا انڈوں کے کٹ کی فرمائش کرتے اور انباڑے کے

اچار کی ترکیب پوچھتے سنا۔'' (صبا۔ مخدوم نمبر۔ ص ۲۰۱)

وہ عمر رسیدہ عورتوں کے بھی چہیتے تھے۔ مسز سروجنی نائیڈو مخدومؔ کا تعارف اپنے بیٹے کے طور پر کرواتی تھیں۔ روپوشی کے زمانے میں مخدومؔ کبھی اختر حسن صاحب کے گھر پناہ لیتے تھے اور کبھی احسن علی مرزا کے گھر اور کبھی کسی ہندو دوست کے گھر میں رہ جاتے تھے۔ احسن علی مرزا لکھتے ہیں۔

''دس پندرہ دن کی اس مختصر سی مدت میں صرف ایک دفعہ میری
ملاقات مخدومؔ سے ہوسکی۔ مخدومؔ میری ماں کے لیے بیٹا بن چکا تھا۔
ان کے (مخدوم کے) کمرے کی کنجی ان کے آنچل سے بندھی رہتی۔
وہ ان کے کپڑے دھوتیں، ان کا بستر صاف کرتیں، کتابوں کو سلیقے
سے جماتیں۔'' (آدم۔ مخدوم نمبر جنوری ۱۹۷۰ ص۔ ۱۵۸)

مخدوم بھی احسن علی مرزا کی والدہ کا بے حد خیال کرتے تھے ایک بار ان کی طبعیت خراب ہوگئی تو مخدومؔ سویرے اُٹھ کر ان کے وضو کے لیے پانی گرم کرتے تھے۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے چولہا نہ جلا پاتے لکڑیوں کو پھونکتے پھونکتے آنکھیں سرخ ہوجاتیں مگر وہ جُٹے رہتے۔

مخدومؔ کی شخصیت ہی ایسی دل کش اور دل موہ لینے والی تھی کہ بہت جلد وہ کسی کو اپنا بنا لیتے تھے۔ مخدومؔ نے کمیونسٹ ممالک کا سفر کیا۔ براٹس لاوا (چیکوسلواکیہ) میں چند گھنٹوں قیام ہوا۔ وہ شلاز کے مہمان بنائے گئے۔ ان کی سہولت کے لیے ایک کار اور ڈرائیور بھی فراہم کیا گیا۔ چند گھنٹوں کی شناسائی کے بعد کیا ہوا اس کے متعلق مخدومؔ لکھتے ہیں:۔

''شلاز مجھے آسٹریا اور سویت کی مشترک چوکی میں لے گیا وہاں

سفید بالوں والوں عورت ساتھی ڈبلیو۔ ایف۔ ٹی۔ یو (دنیا کے
مزدوروں کی انجمن) کی طرف سے مجھے لینے کے لیے موجود تھی۔
ایک دوسرے سے رخصت کا لمحہ بھی آ پہنچا۔ گوتھوڑی دیر کی دوستی تھی
مگر سب دل گرفتہ تھے کہ اب جدا ہونا ہے۔ مصافحہ کیا بغل گیر ہوئے
شلاز نے کسی قدر ضبط سے کام لیا مگر ڈرائیور ساتھی کی آنکھیں بھر
آئیں اور بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔'' (مخدوم محی الدین : اجنبی:
اخبار سیاست ۱۹۵۷)

ان میں کوئی ایسی بات تھی کہ اپنے پرائے، غریب، امیر، جاہل، دانشور سب ان سے مل کر انھیں چاہنے لگتے تھے۔

یوں تو مخدوم کے چاہنے والے بہت تھے۔ انھوں نے برصغیر کے شہر نہیں دیکھے بلکہ ایک دنیا کی سیاحت کی۔ لیکن دکن سے انھیں بے پناہ محبت تھی یہاں کی قدریں اور روایتیں ان کی شخصیت کا حصہ تھیں۔

سرور ڈنڈا کی یاد میں حیدرآباد میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ مخدومؔ اس کی صدارت کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے شوخی سے اپنے وطن کا مذاق اڑایا۔ مخدومؔ نے شاعر کو بھرے مجمع میں ڈانٹا اور اسے کلام سنانے سے روکا۔

مخدومؔ کی مئے نوشی ان کی ذات اور چند دوستوں تک محدود تھی۔ انھوں نے کبھی اعتدال سے تجاوز نہیں کیا۔ نہ کبھی کسی محفل کو بدمزہ کیا۔ جب انھیں اپنی حد سے گزرنے کا احساس ہوتا تو چپکے سے محفل چھوڑ دیتے انھوں نے کبھی عالم مدہوشی میں جھومتے ہوئے مشاعروں میں شرکت نہیں کی۔

پرکاش پنڈت نے ان کے کلام ہندی ترجمے کے پیش لفظ میں یہ واقعہ لکھا ہے:

''اردو کا پرسدھ پرگتی شیل شاعر اور مخدوم کا پرم متر مجاز لکھنوی
سبھاؤ انوسار ایک مشاعرے میں اس بری طرح شراب پی کر آیا کہ
اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اور اس کے منہ سے شبد نہ نکلتے تھے اپنی
متر تا کے باوجود مخدومؔ نے مائیکروفون تھام کر مجازؔ کو بری طرح ڈانٹنا
شروع کیا۔ ''تم اپنی کلا کو یتا پرکاش لے کر جنتا کے اندھیرے دلوں
میں اترتے ہو۔ اتیاچاری شامک وِرگ نے انھیں ودیا، ساہتیہ، سبھیتا
اور سنسکرتی سوگنوں سے ونچت کر رکھا ہے۔ وے پیاسوں کی طرح
تمھارے گرد ایکتر ہو جاتے ہیں۔ انھیں تمھارے شراب کے بھبھکوں
کی آوشکتا نہیں۔ ان کے جیون میں پہلے ہی بہت سی گندگیاں ہیں۔''
(مخدوم محی الدین ترقی پسند شاعر۔ انقلابی رہنما۔ ص۔۵۴)

لوگ مخدومؔ کو اس قدر چاہتے تھے کہ 11 اکتوبر 1969ء کی شام آندھرا سرسوت پریشد ہال میں ''یادِ مخدوم'' کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے صدارت کی۔ دیگر مقررین کے علاوہ سلیمان اریب ایڈیٹر نے مضمون ''آخر شب کا مسافر'' پڑھا۔ اریب جب یہ سطریں پڑھنے لگے کہ ''رات کے دو بجے ہیں۔ مخدومؔ کہتے ہیں ہاں یار نشہ ٹوٹ رہا ہے مگر شراب اور ملے گی کہاں؟ یہ شراب اور عورت ہر جگہ اور ہر وقت کیوں نہیں ملتی؟''

سامعین میں کوئی اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بے پناہ ہوٹنگ شروع ہوگئی۔ اریب نے اس واقعے پر اصرار کیا تو ہوٹنگ میں مزید اضافہ ہوا۔ ان پر ٹماٹر اور گندے انڈے پھینکے گئے۔ شاذ تمکنت کا خیال ہے کہ شاید لوگوں کو پہلے ہی اس مضمون کی بھنک پڑ گئی

تھی اس لیے وہ تیاری سے آئے تھے۔

مخدومؔ نے نوجوانوں کو علمی ، ادبی ، تہذیبی ، صحافتی ، سیاسی اور نظریاتی محاذ پر غیر شعوری طور پر کام کرنے کے لیے اُکسایا تھا۔ مخدومؔ کا دوران کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ مخدومؔ آج بھی باجی جمال النساء، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، پروفیسر مغنی تبسّم اور جناب مجتبیٰ حسین ، رانی دھن راج گیر، لکشمی دیوی راج ، نرسنگ راؤ ، اودیش رانی ، حمایت اللہ، حکیم راگی ، وٹھل راؤ، نصرت محی الدین کے دلوں اور آنکھوں ہی میں بسے ہوئے نہیں ہیں بلکہ یہ ورثہ دوسری نسل تک منتقل ہوگیا ہے۔ ہماری نسل نے بھی مخدومؔ کے فن اور شخصیت کو محفوظ کرنے کا بیڑہ اُٹھایا ہے۔ یہ سیمینار بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ آخر میں سلیمان خطیب کی نظم ''لوک دوانہ'' پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

جا کو میدک گھر گھر پوچھا' بانکی ترچھی ٹوپی والا
من کا موجی ننھا ساتھی مخدوم دوانہ کاں ہے جی
دل میں چھالے آنکھ میں آنسو پاؤں میں کانٹے ہاتھ میں پھولاں
مسجد مندر رانگے پچھے ایسا دوانہ کاں ہے جی
چمپا چنبیلی دَونا مروہ گیندہ سنہرہ جوہی بیلا
جا کو جس کے گیت ہیں مہکے سائیں سیانا کاں ہے جی
بھاگ نگر کے بانکے لوگاں لے کو بھاگے بنسی والا
بھیگے پلکاں دے کے ساجن نرم کلیجہ چھنی چھنی
بھکے بیٹھے، مال اٹھایا، لوک دوانہ کاں ہے جی

☆☆☆

پروفیسر ریحانہ سلطانہ
صدر شعبۂ تعلیم نسواں' مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی' حیدرآباد

مخدوم شاعر فکر و عمل

مخدوم کی زندگی ہمہ جہت حیثیت کی حامل تھی۔ وہ ایک شاعر، سیاست داں، سماجی کارکن' غریبوں اور بے کسوں کے مسیحا تھے۔ مخدوم سے پہلے جامعہ عثمانیہ میں جمود تھا مخدوم نے اس جمود کو توڑا انہوں نے ابتداء میں کئی ڈرامے لکھے اور اداکاری بھی کی جس سے معترف ہوکر انہیں شانتی نکیتن میں شرکت کا پیشکش بھی کیا گیا۔ جہاں تک مخدوم کی شاعری کا تعلق ہے اس کا آغاز 1933ء سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے نظم پیلا دوشالہ لکھی مجنوں گورکھپوری کے رسالہ ایوان میں 1934ء میں طور کے زیر عنوان مخدوم کی نظم پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے ہر محفل میں مخدوم کے کلام کا چرچا ہونے لگا۔

مخدوم نے شعری فکر سے محنت کشوں کی ہمہ گیر تحریک میں قدم رکھا۔ 1934ء میں انہوں نے ہی جناب سبط حسن، اختر حسین رائے پوری اور ڈاکٹر جے سوریا کے اشتراک سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی اپنی ذاتی ذہانت وفراست اور شعری معیار کی بنیاد پر کل ہند ادبی تنظیم کے رہنماؤں میں شمار ہونے لگے۔

1939ء میں مخدوم کاسٹی کالج میں بحیثیت استاد تقرر عمل میں آیا اس وقت تک مخدوم شاعر کی حیثیت سے مقبول ہو چکے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد کی ہر محفل میں مخدوم کی نظمیں سنائی دیتی تھی۔

ان کی نظم ''انقلاب'' پر تو علماء نے کفر کا فتویٰ بھی صادر کر دیا تھا۔ 2 سال تک سٹی کالج میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔اس دوران ان میں سیاسی شعور پختہ ہونے لگا۔ اور سیاسی مصروفیت کا دائرہ مزید وسیع ہوتا گیا کالج میں مختلف گوشوں میں دبی آواز میں مخدوم کی اشتراکی تحریک کا چرچا ہونے لگا۔جس سے ان کے لیے ملازمت کا دائرہ تنگ ہوتا گیا۔بالآخر 1941ء میں انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔اس طرح مخدوم ملازمت کی قید سے آزاد ہو گئے۔

آزادی اور جمہوریت کے لیے آواز بلند کرنا اسلامی اقتدار کے سامنے اسلام دشمنی کا وسیلہ بنا کیونکہ 1934ء میں مخدوم کمیونسٹ پارٹی کا حیدرآباد میں احیاء ہو چکا تھا۔آندھرا مہاسبھا جو ایک خالص تہذیبی اور ثقافتی تنظیم تھی۔روی نارائن ریڈی اور مخدوم محی الدین کے زیر اثر کمیونسٹ تحریک کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بن گئی اس طرح مخدوم کمیونسٹ تحریک کے روح رواں بن گئے۔1942ء میں انہوں نے پارٹی کی ہدایت کے مطابق ریلوئے ورکرس یونین میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ملازمت سے استعفیٰ دیتے ہی بغاوت کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ تین ماہ کی سزا کے بعد انہوں نے عوامی خدمت کا یہ کام انتہائی جوش وخروش سے شروع کیا۔اسی یونین کے پرچم تلے 1945ء میں انہوں نے مزدوروں کی پہلی تنظیم قائم کی۔ جو حیدرآباد کی مطلق العنان حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرہ میں شامل تھی۔

44 -1943ء کی طلباء تحریک میں حصّہ لینے والوں میں اکثر طلباء مخدوم کی انقلابی نظموں کے توسط سے ان کا نام سنتے ان میں سے کئی ایک ایسے تھے جنہیں مخدوم کو دیکھنے کا بھی موقع نہیں ملا لیکن سبھوں نے مخدوم کی نظمیں کسی نہ کسی کے واسطہ سے پڑھیں اور اس احساس کے ساتھ کہ وہ ایک نظریہ میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔یعنی ان کی نظموں کو پڑھتے اور کمیونسٹ تحریک میں شامل ہوتے۔

ان کی نظموں نے نوجوانوں اور مظلوموں کے ذہنوں کے بند دریچوں کو کھولا غربت اور ظلم اور زیادتیوں کے خلاف غم وغصّہ کا احساس دلایا جہد اور جستجو کا تصور دیا۔ظلم اور ناانصافیوں سے لڑنے

کا حوصلہ دیا۔مخدوم کی شاعری نوجوان نسل میں چنگاری بن کر سلگنے لگی۔

ہر شاعر اپنی ذات اپنے عہد اور سماج کو دیکھے بغیر شعر کی تخلیق نہیں کر سکتا۔انسان اپنی عمر سماج اور معاشرے کے کسی بھی حصّہ یا تجربے کے توسط سے اپنے باطن کے فطری شعور کو بلوغیت و بصیرت عطا کرتا ہے۔پھر رفتہ رفتہ یہ شعور مخصوص مزاج واحساسات ونفسیاتی مشق کے ساتھ مختلف مرحلے طئے کرتے ہوئے ادبی تخلیق کا وسیلہ بنتے ہیں اور یہی احساسات شاعر کی تخلیق کے دوران جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ان حالات میں شاعر اپنی سوچ اور کرب کو ابلاغ کے ساتھ انفرادیت بنائے رکھتا ہے۔یہ عمل ہر شاعر کی زندگی میں ہوتا ہے۔اور اگر ایسا شاعر جو شاعر ہی نہیں بلکہ وہ ایک عوامی قائد بھی ہو تو اس کی تخلیق کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے۔شاعری کے ذریعے ہی قوم کی ذہنی اور تہذیبی نشو ونما کو سمجھا جا سکتا ہے۔مخدوم نے ذہنی ارتقاء اور اس دور میں ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا اور اس کا اظہار شاعری سے کیا۔

حیدرآباد میں ترقی پسند وذہنی ارتقا میں مخدوم کا بڑا حصّہ رہا ہے۔مخدوم کو مختلف زاویوں سے دیکھا جاتا ہے۔گوپی چند نارنگ مخدوم کو ''مضطرب'' قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر مسیح الزماں کردار کا غازی کہتے ہیں۔

مخدوم کی شخصیت کا جہاں تک تعلق ہے وہ ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے انفرادیت رکھتے ہیں۔کسی بھی شخص کے فنا ہو جانے کے بعد بقائے دوام حاصل کرنے کا راز یہی ہے کہ جو لوگ اپنے کام اور اپنی حیات کا رشتہ لاکھوں عوام سے جوڑ نہیں پاتے وہ مر جاتے ہیں۔کہیں کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی اور جن کے کام کی جڑیں عوام میں پیوست ہو جاتی ہیں۔انہیں کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی ایسی شخصیت تاریخ کا ایک جز بن جاتی ہے۔وہ لاکھوں کی زندگی اور حیات کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔مخدوم محی الدین ایسی ہی ایک انفرادیت والی شخصیت کا نام ہے۔جنھوں نے اپنے مخصوص کلام کے ذریعہ اس دور کے نوجوان نسل میں ایک جوش ولولہ پیدا کیا۔کمیونسٹ نظریات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔انہوں نے سماج کے ہر طبقہ میں جھانکا غربت اور زیادتیوں کے خلاف غم و

غصہ کا احساس دلایا عوام کو اشتراکی نظریات سے قریب ہونے کی دعوت دی ان کے لگایا ہوا کمیونزم کا خواب آج بھی سرسبز ہے۔ ان گنت مرد و عورتیں ان تصورات سے عوام کو روشناس کر رہے ہیں۔ اور جدوجہد میں مصروف ہیں ظلم و ناانصافیوں سے لڑنے کا حوصلہ مخدوم کی شعری اور تصوراتی فکر کا ہی نتیجہ ہے۔

مخدوم نے دل میں چھپی ہوئی تمام پوشیدہ صلاحیتوں اور خوبیوں کو اپنے بصری تصورات میں پیش کیا۔

مخدوم کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں حیدر حسن نے اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

''ان کی زندگی اور شاعری پر غور کرتا ہوں تو وہ زندگی اور شاعری دونوں مجھے دو الگ خانوں میں بٹی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی شاعری کے ایک خانے میں خالص سیاست بغاوت انقلاب اور اشتراکیت ہیں۔ دوسرے خانے میں دوستیاں ان کا عشق ہجوم وسال سے دنیائے مصالحت مفاہمت سب ہی آجاتے ہیں۔'' (حیدر حسن۔ نیا آدم۔ صفحہ نمبر ۱۲۴)

مخدوم ابتداء سے ہی اپنے ساتھیوں میں مقبول تھے ایسے دور میں جب کہ بڑوں کے سامنے کسی کی لب کشائی کی مجال نہ تھی حیدرآباد کے ماحول میں بہادر یار جنگ انا الملک کا نعرہ دے کر دکن فیکٹری میں روزآنہ دو آنے اجرت پر کام کرنے والے آٹھ دس سال کے بچوں کے سرپرستوں میں حیدرآباد کے تاجدار ہونے کا خبط پیدا کر چکے تھے ایسے میں مخدوم کی شاعری نکھرنے لگی مادی و معاشی آسودگیوں کو ادبی فضاء میں شعری حیثیت کے ساتھ سمونے لگے۔

مخدوم نے خارجی مضامین کو داخلی رجحان بنا کر شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی جس سے ان کی شاعری میں داخلی اور خارجی کیفیات کا ایک امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔

پردہ دکن میں راگ پوشیدہ
راگ وہ جس میں آگ پوشیدہ
بانسری بجائے جاتا ہے
آگ تن میں لگائے جاتا ہے

بساط رقص میں جذبات کی شدت بھی ہے۔ اور گہرائی بھی تجربات افکار، واردات اور مسائل ان سب کو حسن و عشق کے رومان سے بھر دیا۔ ان کی شاعری میں ایک انفرادیت تھی۔ انہوں نے شاعری اور سیاست دونوں میں توازن برقرار رکھا۔ مختلف سماجی دباؤ پڑتے رہے لیکن انہوں نے کبھی دستبرداری اختیار نہیں کی۔ ہندوستانی قوم کی محرومیوں کو شاعری کے ذریعے منظر عام پر لایا۔ ان کی شاعری میں سماجی اور تہذیبی شعور بھی ہے عمل کی ترغیب کا فلسفہ بھی ملتا ہے۔ زندگی کا مثبت رویہ ہر رنگ میں ملتا ہے۔ ان کے کلام میں زندگی سے شکایت بھی ہے زندگی سے الجھاو بھی ہے۔

پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اترے ہیں پانی میں نہانے

مخدوم نے زندگی کو ادب کے نرم و نازک تعلقات اور اٹوٹ وابستگی بھر کر کلام کو رومانی بنا دیا پھر بھی سماج کا پرتو ملتا ہے۔ جو ان کی فن کاری ہے۔

اُڑ رہا ہے غبار نور بدن
پھیلی جا رہی ہے بوئے دہن

تیرے دیوانے تیری چشم نظر سے پہلے
دار سے گزرے تیری راہ گزر سے پہلے

ایک طرف رومانس ہے تو دوسری طرف ساز زندگی کا حسین و لطیف امتزاج ملتا ہے مخدوم نے اپنی شاعری میں ایک نئی جہد پیدا کی تھی۔

راج بہادر گوڑ کہتے ہیں۔

''ہندوستانی قوم کی محرومیوں کا درد و کرب دور کرنے میں مخدوم کا بڑا حصہ رہا ہے۔
مخدوم کے پاس آرزو ہے مگر غم آرزو نہیں۔ حال کی آسودگی سے وہ تڑپ جاتے ہیں
لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی قنوطیت کا شکار نہیں ہوتے کیونکہ وہ مستقبل سے مایوس نہیں۔
وہ امید سے خوشی اور جدوجہد سے اعتماد حاصل کرتے ہیں۔''

مخدوم ایک عوامی شاعر تھے اور مزدوروں کے مسیحا کی حیثیت سے شناخت تھی۔ ٹریڈ یونین کے

رہنما کی حیثیت سے عوام میں جانے جاتے تھے۔ان کے اشعار میں جا بجا جہد اور مستقبل کی امید جھلکتی ہے۔

خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارماں برافگندہ نقاب آئے گا

وہ اپنی سیاسی باغی زندگی میں ایک ہی شخص نظر آتے ہیں۔انہوں نے روایات کی زنجیروں کو توڑا۔ بہت سی قدروں سے گریز بھی کیا۔ان کی دوستانہ محفلوں میں سیاست، طبقہ، مذہب اور جنس کے تمام امتیازات ختم ہو جاتے تھے۔ان کے دوستانہ برتاؤ میں لچک ہوتی تھی۔

مخدوم آزاد طبیعت کے قائل تھے۔ ان کا مشرب وسیع تھا۔ ان کی شعری طبیعت کے سامنے کسان کی بیٹی ہو' راج کماری یا مالوے کی من موہ لینے والی سرزمین کی دوشیزہ ان کے ساز دل کے تار کو جنبش ہوتی کوئی نہ کوئی ادا بھا جاتی۔

دختر پاکیزگی نا آشنائے سیم وزر
دشت کی خود رو کلی تہذیب نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام و در
اجنبی کو دیکھ کر خاموش مت ہو' گائے جا
ہاں تلنگن گائے جا' بانکی تلنگن گائے جا

ایک طرف رومانی انداز میں سادگی کے ساتھ اظہار کیا ہے تو ساتھ میں بلند نصب العین بھی ملتا ہے وہ سماجی تعلقات، باہمی اتحاد و یکجہتی کا تصور بھی ہے۔مخدوم کے دوست جی یم عمر خاں نے اس طرح اظہار خیال کیا:

''مخدوم لا مذہب نہیں مخدوم شاعر نہیں ہے۔مخدوم صرف لیڈر نہیں ہے۔مخدوم، مخدوم ہی نہیں بلکہ ایک بانگ درا ہے۔سوتوں کو جگانے کے لیے ایک نغمہ ہے، روتوں کو

ہنسانے کے لیے ایک تلوار ہے مظلوموں کو سہارا دینے کے لیے ایک شعلہ ہے، ظلم کو مٹانے کے لیے ایک آہنی عزم ہے باطل سے ٹکرانے کے لیے ایک انسان ہے ہر زندگی سے پیار کرنے کے لیے۔''

انہوں نے ابتداء سے ہی نوجوانوں کے ذہن و افکار کو اپنی شعری تخلیق کا موضوع بنایا۔اور رفتہ رفتہ نئی نسل کا اعتماد و احترام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔نظم انتظار، آتش کدہ جنگ ہے۔ یہ وہ نظمیں تھیں جن میں ترنم، جوش، رومانس، تحریک، ولولہ اور ایک تڑپ موجود ہے۔جس کو عوام نے خوب سراہا اور ہر محفل کی زینت بنے۔ان کے مشہور نغمے رات بھر دیدہ نمناک میں لہراتے رہے۔خدا بھی مسکراتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے۔نوجوانوں میں مقبول تھے۔

ایسے دور میں جبکہ شاہی رعب کی پرچھائیاں ابھی برقرار تھیں حیدرآباد میں مخدوم کی مقبولیت یا کمیونسٹ تحریک کو منظم کرنے اور موثر کرنے میں مخدوم کی شاعری کو بڑا دخل ہے۔مخدوم کی ایک جھلک دیکھنے یا نظم سننے کے لیے گھنٹوں پہلے بھیڑ جٹ جاتی لوگ جھوم اٹھتے کئی تکلیفیں اُٹھا کر مخدوم کی محفلوں میں شرکت کرتے۔مخدوم کی ایماء پر حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد پڑی اور ریاست میں ایک طوفان بپا ہوا۔پہلی بار زمیندارآنہ پالیسوں اور امراء کے خلاف عوام کی ہتھیار بند تحریک شروع ہوئی مخدوم نے اپنے کلام سے نئی نسل کو للکارا۔وہ للکار ایسی رہی ہے کہ آج بھی گونج بن کر ہر طرف ساری ریاست میں سرگرم ہے۔

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ
آندھیوں آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرہ ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

اس طرح مخدوم نے ایک دہکتا ہوا پیغام دیا ہر ایک کی زبان پر انقلابی گیت تھے۔ان کی انقلابی نظمیں بڑی عقیدت سے سنی جاتی تھیں۔لوگوں کی مختلف ٹولیاں بس اس بات میں جٹی رہتی کہ مخدوم کو کس طرح روپوش رکھا جائے۔

''مخدوم انقلاب کا شاعر ہے فکر و جنون سے ہولی نہیں کھیلتا۔ وہ اندو مال سے زخم کے لیے گنگناتا ہے اس کے کلام میں نئے خون کا ترنم رقص کرتا ہے۔''

(رائے محبوب نرائن صفحہ نمبر ۱۲۸ نیا آدم)

ان کے کلام میں تلخی بھی ہے تمنا بھی ہے۔انسان دوستی جمالیاتی اقدار غزل کا بانکپن سب کچھ قید ہے۔مخدوم کے کانوں میں طوق و زنجیر کی جھنکار کا شور ملتا ہے۔مخدوم کی شاعرانہ خوبی اور بر تری کا کوئی تعلق ان کی ترقی پسندی یا انقلابی زندگی سے نہیں تھا ان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ ایک وحدت تھی اور ان کی شاعری کو پوری شعوری زندگی کے اس اشتراکی نصب العین سے الگ کر کے انہوں نے تمام تر فکر و صلاحیتوں کو شاعری میں ضم کر دیا تھا۔ انہوں نے روایات کی بہت سی زنجیروں کو توڑ ڈالا، بہت سے لایعنی قدروں کو پامال کیا، شعر و زبان کی فنی پابندیوں کو ٹھکرایا۔

ظلمت کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگ خوں خوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمن جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں

ترقی پسندی اور اشتراکی انقلاب کے پروانے آج بھی مخدوم کے کلام اور نظریات کو اپنا مقصد حیات بنا کر دیکھتے ہیں۔ان کی شاعری میں روح کا حسین ترین جوہر اور نفس کی پاکیزگی موجود ہے۔مخدوم کا سرمایہ مخدوم کے الفاظ میں اس طرح ہے۔

''زماں و مکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں timeless ہوتا ہے اور شاعر

اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔''

مخدوم کا سرمایۂ شعر اسی خصوصیات کا حامل ہے۔ان کی رومانی شاعری کا ابتدائی دور انسانی جبلتوں اور سماجی تقاضوں سے مطالقیت پیدا کرنے کی مسلسل نمائندگی کرتا ہے۔ان کی شاعری میں تہذیبی انقلاب کی ضرورت کا احساس بھی ملتا ہے۔اور عام آدمی کو استحصال سے نجات کی طرف بھی راغب کرتے ہیں۔عام آدمی اور انسان کے درمیان میں فرق و امتیاز کو اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔مخدوم کے کلام میں ایک ایسا پیام ہے جو انسان کی غلطیوں کے ساتھ اس کے وجود کا احساس پیدا کرتا ہے۔اور اس احساس سے ہی ایک تحریک ہوتی ہے۔

انسان اور اس کی مسرتوں کو وہ سب سے بڑی قدر قرار دیتے ہیں۔انسان کے دل میں اس کی عظمت کا احساس اس طرح دلاتے ہیں۔

ہم تو کھلتے ہوئے غنچوں کا تبسم ہیں ندیم
مسکراتے ہوئے ٹکراتے ہوئے طوفانوں سے

ایسے وقت جب کہ سرمایہ دارانہ نظام موضوع بحث بنا ہوا تھا۔مزدور اور کسان اپنی فکر میں رہتا ہر شعبۂ حیات میں کسی نہ کسی قسم کا استحصال تھا انسانی ذہن اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور نئی صبح کے انتظار میں تھا۔جن کا اظہار بہت خوب کیا ہے۔

پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی
زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی
زندگی رنگ گل کا بیاں دوستو

ایسے کئی اشعار تھے جو لوگوں کی زبان پر تھے۔سب ہی استحصال، عدم مساوات اور نا انصافیوں سے بیزارگی کے لیے مخدوم کے اشعار گنگناتے تھے۔مخدوم کی شاعری میں محنت اور محبت کا امتزاج بھی ملتا ہے۔وہ غیر متوازن صنعتی ارتقا سے سوال بھی کرتے ہیں، نا آسودگی کا تجزیہ بھی کرتے

ہیں۔

ہر ایک زخم کے اندر ہے زخم درد میں درد
کہیں گلاب کہیں کیوڑے کی بستی ہے

سماج میں جو نا آسودگی، گھٹن اور اضطراب سے غیر متوازن ماحول بن چکا تھا اس کی جیتی جاگتی تصویر مخدوم کی شاعری اور نجی زندگی دونوں میں ملتی ہے۔ روایتی شاعروں کی طرح اپنی سماجی ذمہ داریوں سے فرار نہیں چاہتے۔ مخدوم کی شاعری سماجی زندگی اور اس کی حقیقتوں کا آئینہ ہے۔ وہ ہمیشہ سچائی اور بے باکی کے پیکر بنے رہے۔ ان کی شاعری ابتداء سے انتہا تک ارتقائی منازل طے کرتی رہی۔

مخدوم نے اپنی شاعری سے انسانی زندگی کی نشو ونما کا گہرا شعور پیدا کیا ہر موضوع پر ان کا کلام عوام کو جھنجوڑتا اور دعوت عمل دیتا ہے۔ انسانی برداری اور عالمی اتحاد کو پیش کرتا ہے۔ یہ جنگ ہے جنگ آزادی ایک ایسی نظم ہے جس کے ذریعہ ہر شعر میں عالمی اتحاد اور انسانیت کے فروغ کو واضح کیا ہے۔ جس سے مخدوم کے عالمگیر تصور کی ترجمانی ہوتی ہے۔

مخدوم کی شاعری میں انقلاب و رومان کا خوبصورت سنگم ملتا ہے۔ مخدوم حیدرآباد میں پہلا شاعر ہے جسکو شہرت ملی لیکن یہ شہرت ادبی تناظر میں بہت کم پرکھی جاتی ہے۔ کیونکہ مخدوم فلمی دنیا میں انقلابی نظریہ کے ہیرو کی شکل میں اُردو والوں کے سامنے پیش ہوئے ہیں۔ علاقائی ادبی تاریخ یا ترقی پسند ادب میں مخدوم کو وہ مقام نہیں ملا جو انہیں ملنا چاہیے تھا۔ مخدوم آج بھی جنوب میں ایک زندہ نظریہ ہے۔ اشتراکی نظریہ رکھنے والے مخدوم کو ایک سماجی، سیاسی رہنما اور شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ عوام مخدوم کے نام پر اُمڈ آتے ہیں۔

گل تر ہو کہ چاند تاروں کا بن سرخ سویرا ہو کہ بساط رقص مخدوم کی شاعری میں انقلاب اور رومان بڑھتا ہی گیا۔ اور زمانے کی نبض کو مخدوم نے شعری سانچے میں ڈھال کر عوام کو متحرک کیا۔

غمزدو شیشے کو چمکاؤ کہ کچھ رات کٹے

اُٹھو کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے
الٰہی یہ بساط رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے شیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو
ہمدمو ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
پھونک دو قصر کو گر کسی کا تماشہ ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

مخدوم کا سرمایۂ شعر اپنی خصوصیت کی بنا پر ایک عہد کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کی رومانی شاعری سماجی جبلتوں اور تقاضوں سے مطابقت پیدا کر کے مسلسل جہد کی نمائندگی کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام کو انفرادی اور اجتماعی تہذیب نفس کا ایک موثر ذریعہ بنایا انسان کو وحدت سے نکال کر ترقی کی بلندیوں پر لے جانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے کلام سے تہذیبی انقلاب کی ضرورت کا احساس دلایا عام آدمی کو استحصال سے نجات دلانے کے لیے محبت کا موضوع بنایا۔

میرے دل میں سرور صبح بہار
تری آنکھوں میں رات پھولوں کی
پھول کھلتے رہیں گے دنیا میں
روز نکلے گی بات پھولوں کی

یہ وہ اشعار ہیں جس سے مخدوم کا محبوب موضوع انسان پوری آب و تاب سے جلوہ فگن ہے۔ عدم مساوات اور ناانصافیوں سے متنفر دیر و حرم کے جھگڑوں سے بیزار زندگی کے حسین مستقبل

کی تمنا لیے ایک پیام دے رہا ہے۔ جو قوم کو ایک فکر، ذہن و عمل کی ترغیب دیتا ہے۔ مخدوم کی شاعری شعلہ بھی ہے شبنم بھی۔ انقلاب کی للکار بھی اور پائل کی جھنکار بھی، علم بھی، عقل بھی، انقلابی ہتھیار بھی، سنگیت کا راگ بھی، بارود کی گرج اور بو بھی۔

مخدوم صرف ایسے شاعر نہیں تھے جو ڈرائنگ روم میں صوفہ پر بیٹھ کر حسن و عشق کا راگ سناتے بلکہ وہ مزدور جھتوں میں جا کر ان کی سیاسی رہنمائی کرنے والے رہنما اور ان کو ایک نظریہ میں باندھ کر جوش و لولہ کے لیے محرک تھے۔

ایسے دور میں جب کہ ابھی سفید پوش امیر زادوں کا ماحول ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ ایک مزدور لیڈر کی حیثیت سے مخدوم کی مقبولیت اور عقیدت ہر کسی پر عیاں تھی۔ اور ہر کوئی مخدوم کا احترام کرتے تھے اس لیے کہ انہیں ایک نئے طرز زندگی اور فکر کی طرف سوچنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

بقول فکر تونسوی۔

''میں نے بڑے بڑے امیر زادوں کو مخدوم کے سامنے سر عقیدت سے جھکاتے دیکھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی جڑیں ہلانے کے لیے پیدا ہوا ہے مگر اس کے باوجود مخدوم کی شخصیت میں ایک طلسم تھا کہ محنت کش طبقہ اس کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا تھا''

محنت کش طبقہ کے علاوہ سرمایہ دار طبقہ بھی مخدوم کی شخصیت کو عزم و ارادہ کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا اور وہ احترام کرتے تھے۔ مخدوم نے کبھی سرمایہ دار طبقہ سے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا۔ کیونکہ یہ ان کے مزاج اور رویہ کے خلاف تھا۔

مخدوم کے شاعرانہ قلم نے عوام کی رگوں میں ہمت اور طاقت کا لہو دوڑا دیا تھا۔ غلامی کے اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کی ترغیب دی تھی۔

آج کے سیاسی اور سماجی پس منظر میں مخدوم کا مجاہدانہ انداز قوم کو للکارتا ہے اور شاعری کے ذریعہ عوام میں جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے۔ یہ فن صرف مخدوم کا ہی تھا جو آج بھی کمیونسٹ تحریک

کے روپ میں جاری و ساری ہے۔ لیکن ادبی اور سیاسی میدان میں انہیں جو مقام اور رتبہ قومی سطح پر ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا۔ نہ ترقی پسند مصنفین و شعراء میں مخدوم کو وہ مقام ملا جس کے وہ حقدار تھے اور نہ ہی سیاسی حیثیت سے وہ رتبہ ملا۔

مخدوم ایک شاعر ایک کمیونسٹ لیڈر سوشلسٹ رہنما تھے۔ مخدوم کے کلام سے اُردو شاعری میں مارکسزم کی نمائندگی ہوتی ہے۔ مخدوم کی اشتراکی شاعری اپنے فن کی بلندیوں پر گل تر اور سرخ سویرا میں ملتی ہے۔ بساط رقص تک مخدوم کے فن میں بہت ارتقاء ہو چکا تھا۔

آل احمد سرور لکھتے ہیں

''انہوں نے چاند تاروں کا بن جیسی نظم لکھی جو میرے نزدیک فیض کی نظم یہ داغ داغ اجالا کے ساتھ آزادی پر اُردو کی بہترین نظم ہے''۔

مخدوم نے آدمی اور انسان کے فرق کو بھی بہت خوب پیش کیا ہے۔

سناتی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا
اب اور کیا کہیں کس کو سوگوار کریں
اٹھو کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہم کنار کریں

مخدوم خود کہتے ہیں شاعر روحانی کرب اضطراب کی علامتوں کو اُجاگر کرتا ہے۔ اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ شعر میں ماورا کی حدوں کو چھوتے ہیں۔ مگر شعر سماج سے ماورا نہیں ہوتا۔ سماجی تقاضے پر اسرار طریقے پر شعر لکھواتے رہے ہیں۔

مخدوم محی الدین گل تر ۲۴/ جولائی ۱۹۹۱ء

وہ جنگ ہی کیا وہ امن ہی کیا؟
دشمن جس میں تاراج نہ ہو

وہ دنیا دنیا کیا ہوگی؟

جس دنیا میں سورج نہ ہو

یہ جنگ ہے جنگ آزادی

ہم سرخ سپاہی ظلم شکن

آہن پیکر فولاد بدن

یہ جنگ ہے جنگ آزادی

آزادی کے پرچم کے تلے

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن

رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن

رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن

ہمدمو

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی

کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے چلو

مخدوم کی شاعری کا یہی سب سے بڑا فن ہے کہ انہوں نے زمانے کی نبض کو سمجھا اور قوم کو پستی و استحصال اور آسودگی سے نکال کر متحرک اور روشن مستقبل کی طرف آنے کی دعوت دی اور آج بھی مخدوم ایک فکر اور جہت و جستجو کی قد آور شخصیت بن کر ہم سب میں موجود ہیں۔ اور ہر استحصال اور پستی کے موقع پر مخدوم ایک رہبر اور رہنما کی حیثیت سے تصور میں ہوتا ہے۔ یہ خوبی ان کے سیاسی فلسفے یا سماجی تحریک کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے فکری کلام کا نتیجہ ہے۔

تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے

الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات

مخدوم نے اپنی سیاسی بصیرت اور شاعری کی فنی خوبیوں سے یہ ثابت کر دیا کہ اگر مقصدی اور سیاسی شاعری میں اس کے مزاج و آہنگ کو متاثر کیے بغیر کسی عظیم تحریک کی بالواسطہ نمائندگی کی جائے تو انسانیت اور محنت شائستگی تہذیب کا پاکیزہ امتزاج پیدا ہو جاتا ہے جس سے سماجی زندگی عیاں ہو کر ہمہ گیریت کی حامل ہوتی ہے۔

مخدوم کے کلام کی بڑی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو اپنے عہد کے دوسرے شاعروں سے مختلف بنا دیا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر مجید بیدار
جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

مخدوم کی شاعری میں پیکر تراشی

اردو شاعری میں پیکر تراشی کی روایت انتہائی قدیم ہے چنانچہ قدیم دکنی مثنویوں میں بھی پیکر تراشی کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ جہاں تک اردو شاعری میں پیکر تراشی کا معاملہ ہے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو کے روایتی شاعروں نے ممکنہ طور پر مبالغہ آمیز پیکر تراشی پر توجہ دی۔ اردو شاعری میں حقیقت پسند پیکر تراشی کی روایت کا آغاز بیسویں صدی میں ہوا اور بلاشبہ ترقی پسند شاعروں کے توسط سے اردو شاعری میں جس قسم کی تبدیلی رونما ہوئی اُسے حقیقت پسند پیکر تراشی کی شروعات کا نام دیا جاتا ہے۔ مخدوم محی الدین اردو کے نامور ترقی پسند شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جنھوں نے اپنی شاعری کے توسط سے پیکر تراشی کے اُس رویے کو اختیار کیا جس میں مبالغہ کا دور دور تک گذر نہیں۔ اس معاملہ میں مخدوم کی شاعری کو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری ہی نہیں بلکہ نظمیہ شاعری میں بھی جس قسم کے پیکر تراشے ہیں اُن کا تعلق زندگی کی حقیقتوں سے ہے۔ اُردو کے بیشتر ناقدوں نے پیکر تراشی کی تعریف کرتے ہوئے اُس کے مختلف انداز کی بھی نمائندگی کی ہے جس کے تحت سمعی پیکر اور بصری پیکر کی اصطلاحات کے ذریعہ ادب کے اس رویہ کی نشان دہی کی ہے۔ اصطلاحات کی فرہنگ میں حقیقت پسند پیکریت کا کہیں ذکر نہیں' جس سے خود

اندازہ ہوتا ہے کہ اردو کے ناقدین نے پیکر تراشی کی حقیقت کو نظر انداز کیا ہے۔ جنوبی ہند کے شہر حیدرآباد سے وابستگی کے بعد مخدوم محی الدین نے شعر و شاعری بھی کی اور عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ جس کے نتیجہ میں اُن کے تین شعری مجموعہ ''سرخ سویرا''، ''گُل تر'' اور ''بساطِ رقص'' وجود میں آئے۔ ان تینوں شعری مجموعوں کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخدوم محی الدین نے ایک اشتراکی پسند شاعر ہونے کی حیثیت سے پیکر تراشی کے دوران حقیقت پسند رویے کو اختیار کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے عہد کے دوسرے شاعروں سے مختلف انداز کے شاعر ہیں جنھوں نے غزل اور نظم کے ذریعہ پیکر تراشی کو فروغ دینے کے دوران حقیقت پسندی کو اپنی شاعری کا شعار بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم محی الدین اپنے عہد کے دوسرے پیکر تراشنے والے شاعروں سے بالکل مختلف شاعر ہیں جو مبالغہ آمیز پیکر تراشی سے گریز برتتے ہوئے روایتی پیکر تراشی کو بھی نظر انداز کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے سمعی اور بصری پیکر تراشی سے زیادہ حقیقت پسند پیکر تراشی کی طرف توجہ دی۔ اسی حقیقت پسند پیکریت کا عکس اُن کی نظموں اور غزلوں میں نمایاں ہوتا ہے۔

مخدوم محی الدین کی شاعری میں حقیقت پسند پیکریت کے دوران نہ صرف مخدوم کا لب و لہجہ تیز ہوجاتا ہے بلکہ وہ شدید جذبہ کے تحت اپنے وجود کو بھی شاعری میں شامل کر لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف شاعری کے محاسن جلوہ گر ہوتے ہیں بلکہ ایسے موقع پر قاری کے جسم میں خون کی روانی بھی تیز ہوجاتی ہے اُن کی شہرت یافتہ نظم ''بنگال'' کے ان اشعار کا مطالعہ کیا جائے تو نہ صرف خون کی روانی میں تیزی آتی ہے بلکہ وہ خود بھی احساس کی شدت میں شامل ہوجاتا ہے۔ نظم کے چند بند پیش ہیں۔

قبر کے روزن سے اپنا سر نکالا موت نے
بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے
خاندانوں کو بنا ڈالا نوالا موت نے

شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے
اُمتِ مرحوم ہو یا ملتِ زناردار
ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مردوزن ' شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار
آہ سوکھی چھاتیوں کی چیخ ' بچوں کی پکار

ان اشعار میں مخدوم نے بھوک اور پیاس سے بلکتے ہوئے عورتوں اور بچوں کے علاوہ ہر مذہب اور قوم کے لوگوں کی پیکر تراشی جس حقیقت پسند انداز میں کی ہے اُس کا اندازہ اُمتِ مرحوم اور ملتِ زنار اور شیخ اور برہمن کی لفظیات سے خود ہو جاتا ہے اور اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر نے بنگال کی ایک کھلی حقیقت کو شاعرانہ پیکر تراشی کے ذریعہ نمایاں کیا ہے جس کے دوران سوائے حقیقت کی عکاسی کے علاوہ کوئی اور مبالغہ آمیز انداز دکھائی نہیں دیتا ' اسی بنیاد پر مخدوم کی پیکر تراشی کو حقیقت پسند پیکریت قرار دیا جائے گا۔ مخدوم کی نظم ''بنگال'' اُن کے ابتدائی شعری مجموعہ ''سرخ سویرا'' میں شامل ہے اسی مجموعہ میں ان کی ایک اور نظم ''نیند'' غزل کی ہیئت میں موجود ہے اس نظم میں بھی مخدوم نے نیند اور اُس کی حالت کو مختلف پیکروں کے ذریعہ نمایاں کیا ہے۔ ضیافتِ طبع کے لیے نظم نیند کے چند اشعار پیش ہیں۔

یہ کس پیکر کی رنگینی سمٹ کر دل میں آتی ہے — مری بے کیف تنہائی کو یوں رنگیں بناتی ہے
یہ کس کی جُنبشِ مژگاں ربابِ دل کو چھوتی ہے — یہ کس کے پیرہن کی سرسراہٹ گنگناتی ہے
مری آنکھوں میں کس کی شوخیٔ لب کا تصور ہے — کہ جس کے کیف سے آنکھوں میں میری نیند آتی ہے

نیند کے تصور اور اُس کے وجود کو جن مختلف انداز کے ذریعہ پیکر عطا کر کے مخدوم نے تخیلاتی انداز سے شاعری کا حق ادا کیا ہے اُس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اپنی شاعری میں مخدوم نے حقیقت

پسند پیکر تراشی کے ساتھ ساتھ جمالیاتی پیکر تراشی کے حسین نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ ان کی مشہور نظمیں ''ساگر کے کنارے'' اور ''تلنگن'' کے علاوہ ''انتظار'' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمالیاتی پیکر تراشنے میں بھی مخدوم کو کمال حاصل ہے چنانچہ وہ انتظار کو پیکر کی حیثیت دیتے ہوئے محبوب کے حسن کو جس نیرنگی کے ساتھ واضح کرتے ہیں اُس کی خصوصیت ملاحظہ ہو۔ نظم کے چند اشعار پیش ہیں۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا
نظریں نیچی کیے شرمائے ہوئے آئے گا
کاکلیں چہرے پر بکھرائے ہوئے آئے گا
آ گئی تھی دلِ مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانے میں شہنائی سی
پتیاں کھڑکیں تو سمجھا کہ لو آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو ہم پا ہی گئے
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی

رومانی پیکر کے تلازموں کو مخدوم نے اس نظم میں جس حسن کاری کے ساتھ استعمال کیا ہے اس کی مثالیں پیش کرنا سخت دشوار ہے۔ نظم انتظار مکمل طور پر پیکریت کی مثال ہے۔ محبوب کے انتظار کے ایک ایک منظر کو لفظوں کی دروبست کے ساتھ شاعر نے حسن کاری کے جس نمونے کے ساتھ واضح کیا ہے اس کا جواب ہی نہیں بلکہ یہ نظم پیکر نگاری کی بے مثال ہی نہیں بلکہ لاثانی حقیقت کی امین بن جاتی ہے۔ خیالی پیکر کو نظم کرتے ہوئے شاعر نے رومانی انداز کو حقیقت سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ شاعر کے انتظار کا کرب صرف شاعر کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ عام آدمی کے کرب کا نمائندہ ہو جاتی ہے شاعری میں اس انداز کو نمایاں کرنا سخت دشوار کام ہے اور مخدوم محی الدین نے بلاشبہ اس معاملہ میں کامیابی حاصل کر کے شعر گوئی کے ذریعے پیکر کے منفرد نمونے پیش کیے ہیں۔

پیکر تراشی کے دوران سمعی اور بصری پیکر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مخدوم محی الدین نے تخیلی سطح سے ابھار کر ایسے بصری پیکر بھی تراشے ہیں کہ تصوراتی فضا میں خیال اپنی حقیقت سے قریب اور انسانی دنیا کا جیتا جاگتا پیکر محسوس ہوتا ہے۔ ایسے بصری پیکر کی نشان دہی مخدوم نے اپنی مشہور نظم ''چارہ گر'' کے ذریعے کی ہے۔ حالاں کہ مخدوم نے سارا منظر خیالی پیش کیا ہے لیکن پیکر کی خوبی یہی ہے کہ وہ حقیقت کا نمائندہ ہو جاتا ہے۔ نظم ''چارہ گر'' سے بصری پیکر کا انداز ملاحظہ ہو۔

ہم نے دیکھا اُنھیں

دن میں اور رات میں

نور و ظلمات میں

مسجدوں کے میناروں نے دیکھا اُنھیں

مندروں کے کواڑوں نے دیکھا اُنھیں

میکدے کی دراڑوں نے دیکھا اُنھیں

بصری پیکر تراشنے کے دوران مخدوم نے یہ کمال پیدا کیا ہے کہ منظر دکھانے کے ساتھ ساتھ اس منظر کے چشم دید گواہوں کو بھی پیش کر دیا ہے اور یہ چشم دید گواہ دو عظیم مذاہب کے نمائندہ اور رندِ اعجاز سے کم نہیں۔ مخدوم نے سادہ لفظیات کے ذریعہ یہ کارنامہ انجام دیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو پیکر تراشی کے شعراء کی صف میں مخدوم کا کلام منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

پیکر تراشی کے دوران نشاطیہ عناصر کو فروغ دینے میں بھی مخدوم کو کمال حاصل ہے اور وہ منفی رویوں سے مثبت خیالات کی نشان دہی پر توجہ دیتے ہیں۔ اردو کا ہر قاری جانتا ہے کہ ترقی پسند شاعری میں ''رات'' اور ''تاریکی'' کس کی علامت ہے۔ لیکن مخدوم کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے رات کے منفی علامتی رویے سے نشاطیہ عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ ان کی مشہور نظم ''آج کی رات نہ جا'' کے پہلے بند کے مطالعہ سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ پانچ مصرعوں کے اس بند میں انھوں نے تیسرے مصرعہ کے ذریعہ ایسا پیکر تراشا ہے جس سے نشاطیہ عناصر کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

رات آئی ہے بہت راتوں کے بعد آئی ہے

دیر سے دور سے آئی ہے مگر آئی ہے

مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا

رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا

آج کی رات نہ جا

مرمریں صبح، چھلکتا ہوا جام، رات کے ٹوٹنے اور اجالوں کا پیام جیسی لفظیات کے ذریعہ مخدوم نے جس نشاطیہ پیکر کو ابھارا ہے۔ اس سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری میں پیکر کو سمونے کی خداداد

صلاحیت مخدوم محی الدین میں موجود تھی یہی وجہ رہی کہ انھوں نے حقیقت پسند پیکر تراش کر جمالیاتی پیکر، سمعی اور بصری پیکر کے علاوہ نشاطیہ پیکر کے ذریعہ شاعری کے انداز میں اضافے کیے۔ پیکر تراشی کے نمائندہ انداز کی پیش کشی کی وجہ سے مخدوم محی الدین کی شاعری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر فاطمہ بیگم
جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

مخدومؔ کی شاعری میں اسلامی تلمیحات و اشارات

اس سمینار کے انعقاد کی تیاری کے سلسلے میں جب مجھ سے موضوع کی بابت دریافت کیا گیا تو میں نے مخدومؔ کے پہلے مجموعہ کلام سرخ سویرا کے انتساب ''محبت اور محنت کے نام'' کے حوالے سے مخدوم کو ان کی صد سالہ تقاریب کے ضمن میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ارادہ کیا اور اسی موضوع کے حوالے سے گفتگو کی۔ اس عنوان پر اظہارِ خیال کے لیے جب میں نے کلامِ مخدومؔ کا مطالعہ کیا تو تب میرے ذہن نے اسلامی تلمیحات اور اشارات اور مخدومؔ کی شاعری پر بات چیت کو زیادہ موزوں سمجھا میں منتظمین کی مشکور ہوں کہ انھوں نے موضوع کی تبدیلی کی اجازت دی۔

مخدومؔ پر گفتگو کی شروعات دستور کے مطابق ان کے ابتدائی حالاتِ زندگی سے شروع ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ ابھی پانچ سال ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ کی دوسری شادی (جس کا پہلے مخدومؔ کو علم نہ تھا) کی وجہ سے وہ ماں کی شفقت و محبت سے بھی محروم ہوگئے۔ چچا مولوی محمد بشیر الدین جو مذہب اور زمانے کے اہم معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے کی زیرسرپرستی مخدومؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس بارے میں خود مخدومؔ کا کہنا ہے۔

''میری ابتدائی تعلیم گھر پر عربی فارسی میں ہوئی اور تلگو گاؤں کے مکتب میں پڑھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا گھریلو ماحول بڑا مذہبی تھا۔ میں نے مولسری کے بیجوں پر ختمِ خواجگان ، مولود شریف پڑھنے سے لے کر مسجد کی جاروب کشی اور اذاں تک دی ہے ۔ مسجد میں نمازیوں کے لیے کنویں سے پانی نکالنا ، ہر جمعہ کو سر منڈانا ، سخت گرم پانی سے نہانا ، اور روزانہ کے معمول میں فرض ، سنت اور نوافل کے علاوہ اشراق اور چاشت کی نمازیں پڑھنا۔''

(مخدومؔ محی الدین سے انٹرویو۔ پروفیسر امیر عارفی)

مخدومؔ کی ابتدائی زندگی مذہبی ماحول میں بسر ہوئی اس پر خود مخدومؔ کے اظہار خیال کے ساتھ ان پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے والے تقریباً سارے محققین متفق ہیں۔ ڈاکٹر داؤد اشرف ۔ مخدومؔ محی الدین، ڈاکٹر شاذ تمکنت ۔ مخدومؔ محی الدین حیات‘ شخصیت‘ شاعری، ڈاکٹر عطاالرحمٰن ۔ مخدومؔ محی الدین جہات اور شاعری ، ڈاکٹر محمد فیروز ۔ مخدومؔ رومانی بھی‘ انقلابی بھی، مغنی تبسم ۔ مخدوم اپنی ذات میں ایک انجمن مختصر سرگذشت ۔

غرض گھر کا ماحول مذہبی تھا اور مذہبی فرائض کی انجام دہی میں سختی برتی جاتی تھی اسی زمانے میں مخدومؔ نے اپنے چچا سے روس اور انقلابِ روس کے بارے میں بہت کچھ سنا اور جب اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تو محبت اور محنت کو اپنا شعار بنایا۔ یہاں تک کہ زندگی کے آخری لمحہ تک اسے اپنے سے جدا نہیں کیا۔

کمیونسٹ طرزِ فکر اور پارٹی سے قربت نے مخدومؔ کو ایک باعمل کمیونسٹ قائد کا جیتا جاگتا پیکر بنا دیا اور وہ ایک فعال لیڈر کی شکل میں نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند بھی مشہور

اور مقبول ہو گئے ۔ اس باعمل شخصیت کی تعمیر میں ابتدائی دور میں جو مذہبی عناصر شامل ہو گئے تھے وہ قریب ساری زندگی ان کے ساتھ رہے اور ان کی شاعری کی اساس بنے رہے ۔ ان کی فکر اور ان کی شاعری کی لفظیات ہمیشہ اس کے زیرِ اثر رہی ۔

''سُرخ سویرا'' کی پہلی ہی نظم ''طور'' ہے ۔ کوہِ طور خالق اور مخلوق کے رشتے ، مخلوق کے تجسُس‘ خالق کی دلدہی کی علامت ہے ۔ مخدومؔ نے ''طور'' عنوان کے تحت اپنی محبت اور اس کی پاکیزگی اور معصومت کی عکاسی کی ۔

نظم ''آسمانی لوریاں'' دن کی رخصت ، شام کی آمد اور رات کی تفصیلات پیش کرتی ہے ۔ اس میں مخدوم رات کی خاموشیوں میں پیامِ حق سنتے نظر آتے ہیں ۔ رات کی خاموشیوں میں اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز اور اس کی تفصیلات مخدومؔ کی زبانی سماعت فرمایے ۔

روزِ روشن جاچکا ، ہیں شام کی تیاریاں
اُڑ رہی ہیں آسماں پر زعفرانی ساریاں
شام رخصت ہو رہی ہے رات کا منہ چُوم کر
ہو رہی ہیں چرخ پر تاروں کی کچھ سرگوشیاں

سرمدی نغمات سے ساری فضا معمور ہے
نُطقِ ربّ ذوالمنن ہیں رات کی خاموشیاں
نیند سی آنکھوں میں آتی ہے جھکا جاتا ہے سر
سُن رہا تھا دیر سے میں آسمانی لوریاں

کُلّیاتِ مخدومؔ محی الدین (ص 103)

نظم ''سجدہ'' مخدومؔ کی ایک ایسی نظم ہے جس میں مخدومؔ اپنی محبوبہ کے ساتھ وقت گذارتے نظر آتے ہیں اور اسی قول کی تفسیر پیش کرتے ہیں کہ خدا کے بعد اگر سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو شریکِ زندگی کو ہوتی کہتے ہیں۔

لُطف سجدوں میں آرہا ہے مجھے
چُھپ کے کوئی بلا رہا ہے مجھے

(ص104)

نظم ''میں'' میں آدم اور ابنِ آدم کی اہمیت اور افادیت، جبر و قدر، مذہبی انداز میں اس طرح اُجاگر کرتے ہیں۔

خود تراشیدہ بُتِ ناز آفریں میرا وجود
میری ذاتِ پاک مسجودِ جہانِ ہست و بُود
دوسرا کوئی نہیں رہتا جہاں رہتا ہوں میں
اپنے سیلابِ خودی میں آپ ہی بہتا ہوں میں
میرے سجدوں کے لیے ہی وقف ہے میری جبیں
میری اقلیم انا میں دوسرا کوئی نہیں

(ص110)

نظم ''جنگ'' میں جنگ کی ہولناکیوں اور تباہیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں ''آفتابِ رحمت دوراں و انجمِ حمیت یزداں'' کے طلوع ہونے کی خواہش کرتے نظر آتے ہیں لکھتے ہیں۔

خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربانِ گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی

انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے
اس فتنہ زار زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے
او آفتابِ رحمت دوراں طلوع ہو
او انجمِ حمیت یزداں طلوع ہو

(ص۔117)

اپنی نظم ''موت کا گیت'' میں انسانی خون کی ارزانی، ایمان و کفر کی تعریف، قسمت اور مقدر کے حیلے وغیرہ بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ گناہ گار انسان فشارِ قبر سے دوچار ہوتا ہے اس طرح ظلم کرنے والوں کو متنبہ کرتے ہیں مخدومؔ لکھتے ہیں۔

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے انسان بہت کھیل چکا
موِر بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگر گوں کردیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں
ظُلمتِ کُفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
سگِ خون خوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دُشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں
جاگ اُٹھنے کو ہے اب خو ں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرے کا تبسّم دیکھو
جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں

قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں
دورِ ناشاد کو اب شاد کیا جائے گا
روحِ انسان کو آزاد کیا جائے گا
(ص120)

تاریخِ اسلام سے واقف ہر مسلمان حضرت علیؓ کی بہادری، ان کی جنگ، ان کی تلوار ''ذوالفقار'' کے بارے میں جانتا ہے۔ اپنی نظم ''جہانِ نو'' میں جہانِ نو کی تعمیر کے لیے مخدومؔ کو ذوالفقار یاد آتی ہے اور کُفر کے اندھیرے کو مٹانے محبت، مساوات، نئی صبح و شام کے اچھوتے نظام کو پھر سے رائج کرنے کے لیے مخدومؔ ذوالفقار کو باطل کی گردنوں پر چمکنے کے لیے یاد کرتے، نظر آتے ہیں۔ یہاں اسلام، بانی اسلام، ترویج اسلام کے شیر، سب کی اہمیت، افادیت مسلمہ طور پر بیان ہوتی ہے۔ اشعار سماعت فرمایے۔

نغمے شرر فشاں ہوں اُٹھا آتشیں رباب
مضرابِ بے خودی سے بجا سازِ انقلاب
معمار عہد نو ہو ترا دستِ پُرشباب
باطل کی گردنوں پہ چمک ذوالفقار بن
ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن
(ص127)

نظم ''نورس'' میں جبرئیل امین اور کلیمی کی تلمیحات کے سہارے مخدومؔ اپنے مافی

الضمیر کو واضح کرتے نظر آتے ہیں لکھتے ہیں۔

جبرئیل امیں کے ہونٹوں کی
بے گائے ہوئے نغموں کی صدا
حوروں کے بہشتی نغموں سے
جو راگ بنے وہ راگ ہے وہ
جس سے کہ کلیمی ملتی ہے
کچھ ایسی ہی اک آگ ہے وہ
(ص137)

نظم ''انقلاب'' میں انقلاب کا انتظار کرتے ہوئے اور اسے جلد آنے کی دعوت دیتے ہوئے مخدومؔ کلامِ پاک میں جن انبیا کا بیان ہوا ہے ان کی مخصوص خصوصیات سے زمانہ کو خالی بتاتے ہیں کہتے ہیں۔

رُخِ حیات پر کا کل کی برہمی ہی نہیں
نگارِ دہر میں انداز مریمی ہی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھانے کے واقعہ کو موجودہ عہد سے جوڑتے ہوئے حق و باطل، خیر و شر کے مقابل میں ہار کر بھی جیتنے کی کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے مخدومؔ نظم پیار کی چاندنی میں رقم طراز ہیں۔

ابن آدم کو سولی چڑھاتے رہو
زندگانی سرِ دار گاتی رہے

''مارٹن لوتھر کنگ'' نظم میں مارٹن لوتھر کے قتل پر مخدومؔ کو آغازِ اسلام کے سن 60ھ کے قتلِ حسین، شامِ غریباں، خیر وشر، نیکی و بدی کا تصادم وٹکراؤ یاد آتا ہے اور وہ بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں۔

یہ قتل، قتل کسی ایک آدمی کا نہیں
یہ قتل، حق کا مساوات کا، شرافت کا
یہ قتل علم کا، حکمت کا، آدمیت کا
یہ قتل حلم و مروت کا خاکساری کا
یہ قتل ظلم رسیدوں کی غم گُساری کا
یہ قتل ایک کا، دو کا نہیں، ہزار کا ہے
خدا کا قتل ہے، قدرت کے شاہ کار کا ہے
ہے شام، شامِ غریباں، ہے صبح، صبحِ حنین
یہ قتل، قتلِ مسیحا، یہ قتل، قتلِ حسین

(ص231)

ڈاکٹر محمد فیروز کے مطابق 108 شعری تخلیقات (بحوالہ مضمون ''مخدومؔ رومانی بھی، انقلابی بھی)' مخدوم کی کل کائنات، درج بالا مثالیں گیارہ نظموں سے لی گئی ہیں ویسے نظم ''نالہ حبیب''، لختِ جگر، بھاگ متی، رات کے بارہ بجے اور چند غزلوں میں بھی علامات، تلمیحات ، اسما ایسے مستعمل ہوئے ہیں جن کے سرے مذہب سے جا ملتے ہیں مثلاً تورات، انجیل، قرآن، ہاجرہ، یعقوب، یوسف۔ کشاکشِ دلِ پیغمبراں، گلوئے یزداں وغیرہ

اس مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مخدومؔ نے کامریڈ کے طور پر شہرت پائی، کمیونسٹ پارٹی

آف انڈیا آج بھی ان کی یاد مناتی ہے اور انھیں اپنا قائد تسلیم کرتی ہے لیکن ادب کے ایک عام قاری کی حیثیت سے جب میں نے سرخ سویرا، گُل تر اور بساطِ رقص اور ان کی یکجا شکل ''کلیاتِ مخدومؔ محی الدین'' کا مطالعہ کیا تو مجھے ان کی فکر، ان کے اسلوب، ان کی سوچ، ان کے الفاظ کے پس پردہ اسلام، اسلامی فکر، اسلامی تہذیب، اسلامی روایات کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آیا جو ان کی پہلی نظم سے ان کے آخری دور کے کلام تک مختلف انداز سے جلوہ گر نظر آیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب مخدومؔ نے ہوش سنبھالا اسلامی مملکت قریب قریب معدوم ہو چکی تھی، اسلامی اصول وقوانین دہرائے تو جا رہے تھے لیکن صدقِ دل سے ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ کارل مارکس کے نظریات یوروپی ممالک میں ہل چل مچا چکے تھے۔ ادب میں انفرادی اور اجتماعی جبر کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہو رہی تھی۔ ہر حساس انسان اپنے ظرف کے مطابق اپنے شعور کے مطابق عالمی سطح پر آزادی، مساوات اور ترقی کا پرچم بلند کرنے کی کوشش میں تھا۔ مخدومؔ اپنے بچپن میں ہی روس اور اہلِ روس کی کامیابی کے بارے میں جان چکے تھے شاید ان ہی وجوہات کے تحت مخدومؔ نے کمیونزم سے اور کمیونسٹ تحریک سے رشتہ جوڑا، غریبوں سے محبت، ان کی عزت، ان کے حقوق کی حفاظت اور ان کے لیے سینہ سپر ہونے کی جرأت نے جو اسلامی اصول وقوانین سے بڑی حد تک قربت اور مماثلت رکھتے تھے نے انھیں اپنی جانب متوجہ کیا اور انھوں نے اس تحریک کے توسط سے غریبوں اور مزدوروں سے ناطہ جوڑا ان کی خدمت کی۔ گھر کی، پارٹی کی، سماج کی، ذمہ داریوں کو ایک بااصول انسان کی طرح پورا کیا اور اپنا روشن اور قابلِ تقلید کردار آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ گئے۔

اس مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدائی زندگی کی تعلیمات کی اہمیت اور افادیت ان

کے ذہن اور ان کے دل نے پوری طرح قبول کی تھیں۔ محبت ، خلوص ، بھائی چارگی ، مساوات ،غریبوں ،محتاجوں کے کام آتے ہوئے خوشی محسوس کرنا ، اپنی ذات سے اوپر اُٹھ کر سوچنا ، مخدومؔ کی طبعیت کا ،فطرت کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ مخدومؔ نے شعوری طور پر اپنے لیے اس راستے کو منتخب کیا جس پر چلتے ہوئے انھیں اور ان کے متعلقین کو پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مخدومؔ کی اس بے لوث خدمت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ مخدومؔ نے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے ایک گھر بھی نہیں چھوڑا اور خود اپنے صاحب زادے نصرت محی الدین کی ملازمت کے لیے بھی اپنے اثر ورسوخ کا استعمال بالکل ہی نہیں کیا۔ ان کے دوست احباب ان کی روزمرہ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی جفاکشی اور سادگی کی کئی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ پارٹی کے دفتر میں سو جانا ۔ عام کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا ۔ بھوک پیاس کی صعوبتیں برداشت کرنا ۔ یہ ساری خصوصیات اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہیں کہ مخدومؔ مذہب کی بنیادی روح کو تسلیم کرتے اور اپنی عملی زندگی میں اس سے کام لیتے تھے۔ اب رہی بات نماز کی پابندی نہ کرنا یا مئے نوشی میں مشغول رہنا اور دوسری باتیں تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بے عیب ذاتِ خدا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے درگذر اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا پر منحصر ہوتا ہے جب کہ بندوں کی خدمت اور محتاجوں کی مدد اللہ کا پسندیدہ عمل ہے۔ استاد محترم پروفیسر مغنی تبسم کے ایک شعر کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں۔

کرم کیا ہے کہ توفیق دی گناہوں کی
کرم کرے گا گناہوں کی جب سزا دے گا

☆☆☆

ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس
ریڈر شعبہ اُردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مخدومؔ کی شاعری میں اسلامی تلمیحات، روایات اور تصورات کا تفاعل

پیش نظر مقالے کا مقصد مخدومؔ محی الدین کو مذہبی مولانا، مُفکّرِ دین یا شاعرِ اسلام ثابت کرنا نہیں ہے۔ مخدومؔ ایک راسخ العقیدہ اشتراکی تھے جنھیں مارکس کے فلسفے پر پختہ ایقان تھا۔ وہ عمر بھر کامریڈ رہے۔ اور مذہب کے متعلق ان کے جو بھی خیالات اور جیسا کچھ رویہ تھا وہ بھی کوئی راز ہائے پنہاں نہیں ہے۔ لیکن یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ پکے کمیونسٹ اور مبلغ اشتراکیت ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی شاعری میں اسلامی تلمیحات ، اسلامی روایات اور اسلامی تصورات کے بہ کثرت حوالے استعمال کیے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مخدومؔ کا بچپن مذہبی ماحول میں گزرا اس سلسلے میں ڈاکٹر سید داؤد اشرف اپنی کتاب ''مخدومؔ ایک مطالعہ'' میں رقم طراز ہیں۔

> ''مخدومؔ کے گھر میں سخت مذہبی ڈسپلن تھا پابندی سے نماز ادا کرنے کے ساتھ ساتھ مغرب اور عصر کے درمیان ''ختمِ خواجگان'' پڑھنا بھی لازمی تھا۔ اس کے علاوہ مسجد میں نمازیوں کے لیے وضو کا پانی بھرنا اور مسجد کی

جاروب کشی مخدومؔ کے فرائض میں داخل تھی۔''

(مخدومؔ ایک مطالعہ حیدرآباد، 1967ء۔ص 15)

بچپن کی تربیت کے نقوش نہایت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔ اس ماحول کے جو اثرات مخدومؔ کے ذہن وفکر پر مرتسم ہوئے وہ ان کے لاشعور کا حصہ بن گئے۔ بعد کے دور میں ان کی تخلیقات میں اسلامی تلمیحات اور اسلامی تصورات کے جو برجستہ اور بے ساختہ حوالے آئے ہیں وہ لاشعور کے اسی سرمایے کا تخلیقی اظہار ہیں۔

مخدومؔ کی شاعری میں اسلامی تلمیحات، تصورات و روایات کی فراوانی کی ایک سے زائد توجیہات ممکن ہیں۔ مثلاً اس کی ایک تاویل یہ ہوسکتی ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ مخدومؔ نے لاشعوری طور پر ان تلمیحات و روایات کا استعمال کیا ہوگا کیوں کہ یہ تمام تصورات ان کے لاشعور کا حصہ تھے۔ دوسری توجیہ یہ ہوسکتی ہے کہ اسلامی تلمیحات اور علائم و اعلام اردو شاعری کی روایت میں شامل ہیں۔ مخدومؔ نے روایت کی تقلید میں ان چیزوں کو اپنی شاعری میں برتا ہے تیسرے یہ کہ اسلام اور اس سے وابستہ عقائد و تصورات، تاریخی واقعات اور دیگر بہت سی باتیں اردو زبان کا جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اب اس زمانے میں اظہار و ترسیل کے جو بھی سانچے اختیار کیے جائیں گے۔ ان میں شعوری یا لاشعوری طور پر ان عناصر کی کارفرمائی اور اثر اندازی ہوگی۔ چناں چہ مخدومؔ کے ترسیلی پیکروں میں اسلامی عناصر کی فعال موجودگی اردو زبان کی لسانی اور تہذیبی خصوصیات کی دین ہے۔ اس طرح کے اسباب وعلل کی تشریح سے قطع نظر پیش نظر مضمون میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مخدومؔ نے اپنی شاعری میں اسلامی تلمیحات، اسلامی روایات اور اسلامی تصورات کو کہاں اور کیسے برتا ہے۔

مخدومؔ کے پہلے شعری مجموعے ''سُرخ سویرا'' کا آغاز ہی ایک ایسی نظم سے ہوتا ہے

جس کا سرنامہ ایک اسلامی تلمیح سے ماخوذ ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے طور ''سُرخ سویرا'' اشتراکی نظام کی علامت ہے۔ اور اشتراکی نظام میں مذہب اور خدا سے فاصلہ ہی برتا جاتا ہے۔ لیکن مخدومؔ کے ہاں یہ عجیب متناقص صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ سُرخ سویرا اپنے باب افتتاح پر ہی طور بداماں نظر آتا ہے، طور علامت ہے، رسالت اور الوہیت کے بلاواسطہ ربط کی تجلیات انوارِ ربّانی کی مخلوق کی اپنے خالق سے ہم کلامی کی نوامیس الٰہی اور نظام دین کی اس کے ساتھ ساتھ طور علامت ہے محبّ اور محبوب کے ملاقات کی۔ معشوق کے دیدار کی۔ حریم ناز میں رسائی کی۔ یار کے ساتھ خلوت کی اور محبوب سے راز و نیاز کی۔ مخدوم نے اسی دوسرے مفہوم میں طور کی تلمیحی علامت کا استعمال کیا ہے۔ اس نظم میں طور سے مراد وہ مقام ہے، جہاں عاشق اپنے محبوب سے ہم نشینی کا لطف لیا کرتا تھا۔ شاعر کھیتوں میں پانی کے کنارے محبوب سے ملتا تھا۔ ان کی اس ملاقات میں آرزؤں کا ہجوم ہوتا۔ الفت کے عہد و پیمان ہوتے۔ یہ دوطرفہ عشق تھا اس لیے عاشق کی کسی بات پر محبوب کے ماتھے پر بل آتا نہ اس کے تیور بدلتے۔ ان کا جذبہ ایسا والہانہ تھا کہ ان کے پیار پر خدا بھی مسکراتا تھا۔

نہ ماتھے پر شکن ہوتی نہ جب تیور بدلتے تھے
خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

اسی مقام کو اس نے طور کہا ہے۔ کیوں کہ یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا ''اس'' نے یہیں اسے محبوب کا دیدار حاصل ہوتا یہیں اس کا محبوب اپنے حسن و جمال کی رنگینیاں اور نظرِ فریب رعنائیاں بکھیرتا۔ یہیں وہ باہم گفتگو کرتے اور عشق کے سفینے میں بہتے چلے جاتے۔ انھیں مستقبل کا کوئی غم نہ ہوتا زندگی ایک لازوال سرور سے مست و مخمور ہوتی۔ ان کی خلوت معصوم رشک طور ہوتی جس میں فرشتے انھیں جھولا جھلاتے اور حوریں غزل گاتی تھیں۔

ہماری خلوت معصوم رشک طور ہوتی تھی

ملک جھولا جھلاتے تھے غزل خواں حور ہوتی تھی

اردو ادب میں زلیخا کی تلمیح حضرت یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے پورے واقعے کا احاطہ کرتی ہے۔ زلیخا عزیز مصر کی بیوی تھی۔ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ملکوتی حسن و جمال پر فریفتہ ہوگئی اور اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے دامنِ یوسف پر بھی دست درازی کی۔ لیکن حق تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے دستِ ہوس سے محفوظ رکھا۔ اس طرح زلیخا علامت ہے عورت کے عشق کی۔ محبوب کو حاصل کرنے کے لیے عورت کے ایجابی یا اقدامی رویے کی۔ عشق میں عورت کی دیوانگی، وارفتگی اور خود فراموشی کی۔ مخدوم نے سُرخ سویرا کی نظم ''لمحۂ رخصت'' میں ''ادائے زلیخائی'' کی تلمیح استعمال کی ہے جو انھیں مفاہیم کی ترسیل کرتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے محبوب سے رخصت ہوتے وقت ایک عورت کے جو جذبات ہوتے ہیں ان کی ترجمانی کی ہے۔ عورت کے دل میں بہت سی آرزوئیں مچل رہی ہیں لیکن زمانے کے خوف سے وہ اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ اور اپنے جسم و جاں کے تقاضوں کو تشنہ رکھتے ہوے الوداعی لمحے کے جذباتی ہیجان سے گزر جاتی ہے۔ مخدوم نے عورت کے جذبات تلاطم کی جمال آفریں مرقع کشی کی ہے جس میں جذبے کی حرارت بھی ہے جسم کی آنچ کا احساس بھی۔ نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو، کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا بانہوں میں

اس کے بعد عاشق کی مشتاق نگاہوں، معشوق کی حیا سے جھکی نظروں، اس کی بھیگی پلکوں میں پنہاں شوق ہم آغوشی، عاشق کے شانے پر پریشاں ہونے کے لیے کاکل کی بے چینی، پیشانی میں سجدوں کے طوفان اور ہونٹوں میں دبی ایک رنگین تمنا کا تذکرہ کرتے ہوئے نظم اس شعر پر پہنچتی ہے۔

وارفتہ نگاہوں سے پیدا ہے ایک ادائے زلیخائی
انداز تغافل تیور سے، رسوائی کا ساماں آنکھوں میں

یہاں معشوق کی جذباتی کیفیت کو جو نشاط وصل کی متلاشی ہے ادائے زلیخائی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے مراد شدتِ شوق کی وہی کیفیت ہے جس کے زیرِ اثر زلیخا رسوائی کی پرواہ کیے بغیر یوسف کو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نظم کا نسوانی کردار بھی اس درجہ از خود رفتہ ہوگیا ہے کہ تغافل برتنے کی کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں اور اس کے سراپا سے اس کے جذبے کا اظہار ہو رہا ہے۔

مخدومؔ نے تلمیحات کا استعمال ترسیل میں سہولت اور جامعیت پیدا کرنے کے لیے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تلمیحات سے بیان میں حسن معنی میں اثر آفرینی پیدا کرنے کا کام بھی لیتے ہیں اس کے علاوہ جذبے کی شدت کے اظہار کے لیے بھی وہ تلمیح سے کمک حاصل کرتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر جہاں انھیں زورِ بیان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے انھوں نے اکثر و بیشتر اسلامی تلمیحات کے ذخیرے سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح کے استفادے کی ایک عمدہ مثال ''مشرق'' ہے جو ان کی ایک اہم نظم ہے۔ اس میں انھوں نے مشرق کی تباہی و زوال، کا ماتم کرتے ہوے اسے جہل، فاقہ، بھیک، بیماری و نجاست کا مکان نیز زندگی، تازگی اور عقل و فراست کا قبرستان قرار دیا ہے۔ مشرق ان کی نظر میں صدیوں سے توہمات اور روایت پرستی کے جذام میں مبتلا ہے۔ اس کے دست و بازو جھڑ چکے ہیں اور اس کا حال دق کے مریض کا سا ہے جس کی صرف سانس چل رہی ہے۔ وہ ایک بے گور و کفن ننگی نعش ہے جو مغربی کرگسوں کا لقمہ بن گئی ہے۔ اس کا وجود ایک قبرستان کی طرح ہے جس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں۔

جہل فاقہ بھیک بیماری نجاست کا مکاں

زندگانی تازگی عقل و فراست کا مسان
وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
ایک ننگی نعش بے گوروکفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں

نظم کے آخری دو اشعار میں مخدومؔ نے دو اسلامی تلمیحات کا استعمال کیا ہے پہلے شعر میں اصحاب کہف کی تلمیح ہے جو نہایت بلیغ ہے۔ مشرق کی مذکور الصدر خرابیوں کا اندھیرا ایک مسلسل رات کی طرح ہے۔ ایک ایسی تاریک رات جس کی صبح ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ جس طرح اصحاف کہف پر صدیوں کی نیند طاری ہوئی تھی اسی طرح مشرق کی زمیں بھی صدیوں سے خوابِ غفلت میں سوئی ہوئی ہے۔

اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خواب اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

خواب اصحابِ کہف کی تلمیح نہ صرف شاعر کے تخیل کی پرواز اور ندرت طبع کی غماز ہے بلکہ اس سے مشرق کے جمود و زوال اور انفعالیت کا نہایت موثر ابلاغ بھی ہوا ہے۔

آخری شعر میں ایک انقلاب کی پیش بینی کی گئی ہے۔ ایک ایسا زبردست انقلاب جس میں تخریب بھی اور تعمیر بھی۔ کیوں کہ تعمیر کے لیے تخریب ضروری ہے۔ آفرینش آدم کی تلمیح کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ مشرق کی اس موت پرورده زمیں کو ڈھایا جائے گا اور یہاں ایک نئی دنیا اور نیا آدم بنایا جائے گا۔ یعنی یہاں ترقی و خوش حالی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا اور

ایک نئی نسل یہاں اُٹھے گی جس کے دل و دماغ زندگی کی حرکت و حرارت اور علم و فکر کی روشنی سے معمور ہوں گے۔

اس زمین موت پرورده کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا

''سُرخ سویرا'' کی نظموں میں موت کا گیت ایک ایسی نظم ہے جس میں باغیانہ خیالات کی شدت اور انقلابی جوش اور تیز و تند لب و لہجے کی کارفرمائی پورے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس نظم کی تعمیر میں مخدومؔ نے شروع سے آخر تک اسلامی تلمیحات، اسلامی روایات اور اسلامی استعارات سے کام لیا ہے۔ نظم کا عنوان موت کا گیت سرمایہ داری اور سامراجی نظام کے لیے پیام مرگ دیتا ہے کیوں کہ اب اس نظام کا ظلم و ستم اور جبر و استحصال اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔

عرش کی آڑ میں (عرش مذہب کی علامت ہے) مکار اور چالاک ظالموں نے معصوم انسانوں کے خلاف درندگی کا خوب مظاہرہ کیا۔

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خون انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مور بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا

آخری مصرعے میں مور و سلیماں کی تلمیح ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام صاحب حکومت بھی تھے اور صاحب نبوت بھی۔ وہ اپنے لشکر کے ساتھ وادی نمل سے گزرے تو ایک چیونٹی نے اپنے ساتھیوں کو فوراً بل میں گھس جانے کو کہا کہ کہیں سلیمان کا لشکر انھیں روند نہ دے۔ ظاہر ہے کہ چیونٹی کی حقیر اور بے مایہ ذات کہاں اور حضرت سلیمان جیسے عالی مرتبت پیغمبر اور عظیم الشان بادشاہ کہاں۔ حضرت سلیمان نے چیونٹیوں پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن موجودہ

دور کی وہ قومیں جنھیں طاقت وحشمت اور قوت واقتدار حاصل ہے اپنے سامراجی اور سرمایہ دارانہ ہتھکنڈوں کے ذریعہ غریب اور کمزور قوموں کو کچل رہی ہیں۔ اس تناظر میں نظم تمام مظلوموں اور مستضعفین کو ''دو عالم کو دگرگوں کرنے'' اور ''قلب گیتی میں شرارے بھرنے'' کی دعوت دیتی ہے۔

وقت ہے آؤ دو عالم کو دگر گوں کردیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں

بعد کے بند کے مصرعوں میں ظُلمت ، کُفر ، ایمان اور ملک الموت کے الفاظ خالص اسلامی تصورات جن سے مخدومؔ نے نظم کی تخلیق میں بلا تامل استفادہ کیا ہے۔ مصرعے ملاحظہ ہوں۔

ع ظُلمت کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں
ع ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو

نظم کے اگلے بند میں مخدومؔ نے سرمایہ داروں اور استعماری طاقتوں کو ان کے برے انجام سے خبردار کرتے ہوئے عذاب قبر کے اسلامی تصور کو بہ طور استعارہ برتا ہے۔ مظلوم اور محنت کش طبقہ جب اُٹھ کھڑا ہوگا تو ظالموں کو معلوم ہوگا کہ قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں۔ موت کا گرداب کیا ہوتا ہے اور قبر کی داب کیسی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ قبر کی داب استعارہ ہے اس صورت حال کا جب استعماری اور استحصالی عناصر چاروں طرف سے گھر جائیں گے اور ہر طرف سے انھیں دبایا جائے گا اور وہ پوری طرح انصاف کے شکنجے میں کسے جائیں گے۔

جان لو قہر کا سیلاب کسے کہتے ہیں
ناگہاں موت کا گرداب کسے کہتے ہیں
قبر کے پہلوؤں کی داب کسے کہتے ہیں

آگے کے بند میں للکار اور پیکار کی کیفیت ہے اور یہ پورا بند اسلامی تاریخ ، اسلامی روایات اور اسلامی تصورات کے حوالوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس میں نہایت تلخ لہجے میں اس نکتے کو اُبھارا گیا ہے کہ اللہ کے بندوں کی دعائیں بے اثر ہوں ، حق کے رسول کو دار و رسن ملے ، شداد جیسے ظالم حکمران اپنے قصر کے دروازے بند کر کے داد عیش دیں اور بھوکے انسان تڑپتے رہیں یہ رب کا منشا نہیں ہوسکتا۔ اگر کن کا تماشا یہی ہے۔ تو ان ظالم حکمرانوں کے محلوں کو آگ لگا دینی چاہیے۔ بند ملاحظہ ہو۔

نالہ بے اثر اللہ کے بندوں کے لیے
صلہ دار و رسن حق کے رسولوں کے لیے
قصر شداد کے در بند ہیں بھوکوں کے لیے
پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشا ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی

آخری بند میں انتہائی غیض وغضب کے عالم میں ہلاکت خیز اور تخریب انگیز طاقتوں کو پکارا گیا ہے۔ زلزلوں ، بجلیوں ، آندھیوں اور جہنم کی ہواؤں کو آواز دی گئی ہے کہ آئیں اور وہ تباہی کے سامان اپنے ساتھ لائیں تاکہ ظلم وستم سے بھری اس زمین اس کرہ ناپاک کو جلا کر خاکستر کردیں۔ اور اس کے بعد زمانے کے کاسے کو رحم وکرم سے بھردیں یعنی عدل و انصاف پر مبنی ایک نیا سماج تعمیر کریں۔ بند دیکھیے۔

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ

آؤ یہ کرہ ناپاک بھسم کرڈالیں
کاسہ دہر کو معمور کرم کر ڈالیں

اس بند میں جو تباہ کن قوتیں مذکور ہوئی ہیں وہ بھی اسلامی تاریخ سے مستفاد ہیں۔ اسلامی روایات میں مختلف قوموں پر عذاب الٰہی کی جو صورتیں بیان ہوئی ہیں وہ یہی ہیں مثلاً قوم لوط پر زلزلے اور لاوے کا عذاب آیا، قوم صالح پر برق صاعقہ ٹوٹ پڑی، قوم نوح پر گھٹائیں، بارش اور طوفان کا عذاب لائیں اور قوم عاد پر آندھی اور ہوا عذاب بن کر نازل ہوئی۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے مخدومؔ نے شعوری طور پر قرآنی روایات سے استفادہ نہیں کیا۔ اعتراض سر آنکھوں پر۔ ہمارا معروضہ یہ ہے کہ یہ تمام روایتیں مخدومؔ نے بچپن میں سنی تھیں۔ یہ ان کے لاشعور میں محفوظ تھیں اور اس بند میں یہی روایات راست حوالوں کے بغیر مبہم انداز میں تخلیقی اظہار کے سانچے میں ڈھل گئی ہیں۔ اگر یہ بات بھی قابل تسلیم نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام حکایتیں، پچھلی نسلوں کے تجربات و مشاہدات آرکی ٹائپ Arche Types کی شکل میں اس بند میں نمایاں ہوئے ہیں۔

مخدومؔ نے متعدد نظموں اور بعض غزلوں کے اشعار میں اسلامی تلمیحات کے ذخیرے سے خوشہ چینی کی ہے۔ ان سب کا تجزیہ اس مختصر مضمون میں مکمل نہیں۔ ذیل میں نظموں کے عناوین کی صراحت کے ساتھ وہ مصرعے یا اشعار درج کیے گئے ہیں جن میں اسلامی تلمیحات کا استعمال ہوا ہے۔ مصرع یا شعر سے قبل تلمیح کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

ذوالفقار : ع باطل کی گردنوں پہ چمک ذو القار بن
داؤدؑ (بہ اشارہ لحن داؤدؑ) ع کسی داؤدؑ کے محتاج تھے سب سازِ فطرت کے (وَلی)
تخت سلیمانؑ : ع نہ تخت سلیماں نہ سرمایہ داری (مستقبل)

مریمؑ۔ مسیحؑ۔ خضرؑ :

نگار دہر میں انداز مریمی ہی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں
(انقلاب)

آلِ قیصر۔ آلِ عثماں۔ گنج قارون۔ تختِ جم۔ تختِ سلیمانؑ۔ طغرل۔ سنجر

نہیں ہے ہم میں کوئی آل ِ قیصر آلِ عثمانی
نہیں ہے گنج قاروں ، تختِ جم ، تخت سلیمانی
نہ ہم میں طغرل و سنجر نہ ہم میں ظل سبحانی
(تماشائی)

خضر۔ آبِ حیات: ع امام تشنہ لباں خضر راہ آب حیات (تلنگانہ)
یوسف: ع خواجہ شہر ہے یوسفؑ کے خریداروں میں (بھاگ متی)
جنگ حنین۔ مسیحؑ۔ حضرت حسینؓ:

ہے شام شامِ غریباں ہے صبح صبح حنین
یہ قتل قتلِ مسیحا یہ قتل قتلِ حسین
(مارٹن لوتھر کنگ)

برمیاہؑ۔ ہاجرہ۔ یعقوبؑ:

میں نے تورات و انجیل و قرآن میں
برمیہؔ ہاجرہؔ اور یعقوبؑ
کے کرب کی داستانیں پڑھی ہیں
(رات کے بارہ بجے)

مسیحانفس:

مہک مہک کے جگاتی رہی نسیم سحر
لبوں پہ یار مسیحا نفس کا نام لیے
(غزل)

قیامت۔حشر:

شہر میں ایک قیامت تھی قیامت نہ رہی
حشر خاموش ہوا فتنہ دوراں چپ ہے
(غزل)

طور:

کچھ پھول سر صحن چمن کھل تو رہے ہیں
اک نور سر طور نظر آ تو رہا ہے
(غزل)

مسیحا:

لب سرد، نظر سرد ، بدن سرد ہے دل سرد
وہ جان مسیحا نفساں آ تو رہا ہے
(غزل)

تلمیحات سے قطع نظر مخدومؔ کے ڈکشن میں بے شمار ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اسلامی روایات یا اسلامی تصورات کی نمائندگی کرتے ہیں۔تخلیقی سطح پر اس قبیل کی لفظیات کا استعمال بھی غیر شعوری طور پر ہوا ہے۔ان الفاظ وتراکیب اور اصطلاحات کے ذریعہ مخدومؔ نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں توانائی ، ابلاغ میں تاثر اور ترسیل میں حسن و جمال پیدا کرنے کی

کوشش کی ہے۔ذیل میں ان الفاظ کی فہرست دی گئی ہے جو اسلامی مزاج اور اسلامی شناخت رکھتے ہیں اور مخدومؔ نے اپنی شاعری میں ان کا بے محابہ اور بے دریغ استعمال کیا ہے۔

نطق رب ذوالمنن ۔سجدہ ۔تسنیم ۔خلد بریں ۔ جبرئیل ۔اسرافیل ۔عرش ۔ساکنان فلک ۔مکاں ۔لامکاں ۔امت ۔دعا۔ازل کا مصور۔حور۔بہشت ۔خدائے دو جہاں ۔دیں ۔روح الامیں ۔ واجب و امکان ۔مناجات ۔حرم ۔عقبیٰ ۔امت مرحوم ۔ خانقاہ ۔ درود ۔ صلوٰۃ ۔ سلام ۔فردوس ۔ بزم الوہی ۔ پیام عبودی ۔ رحمت دوران ۔حمیت یزداں ۔ کفر وایماں ۔ملک الموت ۔قبر کی داب ۔رسول ۔کُن ۔جہنم ۔ جنت ۔رحمت یزداں ۔دوزخ ۔شور محشر۔مجاہد۔تلمیذ رحماں ۔پیغمبر۔کعبہ۔

مثلاً ذیل کے اشعار میں دیکھیے مخدوم نے ان الفاظ کو کس طرح برتا ہے۔

لطف سجدوں میں آرہا ہے مجھے
چھپ کے کوئی بلا رہا ہے مجھے
(سجدہ)

او آفتاب رحمت دوراں طلوع ہو
او انجم حمیت یزداں طلوع ہو
(جنگ)

درودِ شوق ، صلوٰۃ و سلام دید نہیں
جو ہے تو اک تپش انتظار اب بھی ہے
(فرد)

نغمہ جبرئیل ہے انسان کا گانا نہیں
صور اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

(اقبال)

مخدومؔ کی شاعری میں اسلامی تلمیحات، اسلامی روایات اور تصورات کی کارفرمائی کا مطالعہ بعض دل چسپ حقائق کو برافگندہ نقاب کرتا ہے۔ جیسے اس مطالعہ میں یہ بات نہایت واضح اور محسوس انداز میں سامنے آتی ہے کہ مخدومؔ کی نظموں میں تلمیحات اور اسلامی روایات و تصورات پر مبنی الفاظ کا استعمال زیادہ ہوا ہے۔ غزلوں میں ان الفاظ و تلمیحات کا ورود کم نظر آتا ہے۔ ویسے مخدومؔ نے نظموں کے مقابلے میں غزلیں لکھی بھی کم ہیں لیکن غزلوں اور نظموں کی تعداد میں جو نسبت ہے اسلامی تلمیحات و روایات کی تعداد اس کے متناسب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں یہ مشاہدہ بھی قابل ذکر ہے کہ مخدومؔ کے پہلے مجموعے ''سُرخ سویرا'' میں اسلامی تلمیحات اور اسلامی روایات کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ اس کے بالمقابل ان کے دوسرے شعری مجموعے ''گل تر'' میں ان کا استعمال نسبتاً کم ہوا ہے۔ اور تیسرے مجموعے ''بساطِ رقص'' میں ان کا استعمال اور بھی کم ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے ''گل تر'' ''سرخ سویرا'' سے قدرے کم ہے اور اس میں نظموں کے علاوہ غزلیات بھی شامل ہیں۔ غزلیات میں مخدومؔ نے تلمیحات کا استعمال کم ہی کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اس میں اسلامی تلمیحات و روایات کے استعمال کا تناسب بھی کم ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے زاویے سے یوں بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ''سرخ سویرا'' کی اشاعت 1944ء میں عمل میں آئی۔ یہ مخدومؔ کے ابتدائی دس سالہ ریاض سخن کا نتیجہ ہے۔ اس ابتدائی دور میں مذہب اور اس کے متعلقات کے بارے میں ان کا رویہ کچھ اور تھا جو مذہبی علائم و اشارات کو برتنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا تھا لیکن بعد کے دور میں شاید ان کے خیالات میں شِدّت پیدا ہوتی گئی۔ اور وہ ان الفاظ و علائم

سے اعراض و گریز کرنے لگے۔ خود مخدومؔ کو بھی احساس تھا کہ گل تر کی شاعری سرخ سویرا کی شاعری سے مختلف ہے۔ اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ''گل تر'' کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ فرق میری نظر میں ایک نیا پن ہے جو عمر، تجربہ اور خود عہد حاضر کی نوعیت کے اپنے ماسبق سے مختلف ہونے کا نتیجہ ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے۔''

''سُرخ سویرا'' کے مقابلے میں ''گل تر'' میں اسلامی تلمیحات و روایات کا تقلیل استعمال ممکن ہے۔ مخدومؔ کے مزعومہ اسی ''سماجی اور شعوری ارتقا'' کا نتیجہ ہو۔

☆☆☆

ڈاکٹر نکہت جہاں
ریڈر نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مخدوم کی شاعری اور سماجی شعور

شاعری انکشاف ذات ہے اور یقیناً شاعر اپنی شاعری سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ لیکن شاعری کو سمجھنے، اس کے فنی محاسن و معائب کا اندازہ کرنے اور اس کی امتیازی کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے شاعر کے ذہن، اس کے نفسیاتی اور سماجی رجحانات اور جذباتی محرکات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ شاعر شعوری طور پر سماج کے متصادم اور پیچیدہ عناصر سے شخصی طور پر وابستہ ہوکر اپنے فن کے ذریعہ اظہار کرتا ہے۔ مخدوم محی الدین کی شاعری بھی ان کے شعور حیات کی جیتی جاگتی تصویر اور فکر و عمل کی سچی ترجمان ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' کا انتساب ''محبت اور محنت کے نام'' ہی مخدوم کے ذہنی رویہ، سوچ اور رجحانات کا عکاس ہے۔ انھوں نے ذاتی غم کے بجائے عوام کے درد و کرب کو ترجیح دی۔ اس کی مثال سماجی موضوعات پر ان کی نظمیں مشرق' اندھیرا، زلف چلیپا اور حویلی وغیرہ ہیں۔

مخدوم کا تعلق اس دور سے ہے جب ادب برائے زندگی کا نظریہ عام ہو چکا تھا اور زندگی سے متعلق مسائل کو ادب کا موضوع بنایا جانے لگا تھا۔ جاگیردارانہ عہد دم توڑنے لگا تھا اور یہ احساس ہو چلا تھا کہ انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال نہیں ہونا چاہیے۔ یہ رجحان اس

دور کے سارے ادب میں نظر آتا ہے۔ 1936ء میں باقاعدہ اردو کے ادیبوں نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ معاشی خوش حالی حاصل کرنے کے لیے عوام کی ذہنی تربیت کی جائے۔ اس تحریک کے پس پشت کارل مارکس کے اقتصادی نظریات کام کر رہے تھے۔ اس تحریک کو ترقی پسندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چناں چہ ترقی پسند ادیبوں نے آزادی کی لڑائی میں اس نظریہ کے تحت ایک خواب دیکھا کہ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر ایک ایسا ہندوستان بنائیں گے جس میں بھائی چارہ ہو، بہتر سماجی حالات ہوں اور کسی قسم کا ظلم نہ ہو۔ مخدوم کی شاعری میں بھی یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

مخدوم جب اپنے ماحول اور گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو انھیں ہر طرف ذہنی انتشار، افلاس، بھوک، غلامی اور اضطراب نظر آتا ہے۔ ان کی نظم ''مشرق'' میں ماحول سے بیزاری اور غلامی سے نفرت کا احساس ظاہر ہوتا ہے۔

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں
زندگانی، تازگی، عقل و فراست کا مساں
وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ
کھیلتی ہے سانس سینے میں مریض دِق کو دیکھ
اک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

مخدوم نے دیکھا کہ ان کا وطن جہل، فاقہ، بھوک، بیماری اور نجاست کا مکان ہے۔ عقل و فراست کا مساں ہے، روایت کا غلام ہے جس میں صدیوں کا جذام پرورش پا رہا ہے۔

مخدوم کی بصیرت نے دیکھا کہ ایک بے گوروکفن ٹھٹھری ہوئی نعش ہے جو مغربی چیلوں کا لقمہ بن چکی ہے۔ ایک قبرستان جس میں کوئی آواز نہیں۔ ایک بھٹکی ہوئی روح ہے جس کا مکان کوئی نہیں۔ لیکن نظم کے آخر میں وہ امید باندھ لیتے ہیں اور نظم کا خاتمہ ایک ایسی نئی دنیا کے تصور پر ہوتا ہے جو انسان دوستی، مساوات اور سماجی انصاف کی پروردہ ہوگی۔

اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا ، نیا آدم بنایا جائے گا

مخدوم اشتراکی نظریات کے حامل تھے جس کا خاص موضوع سماج کے معاشی حالات کا تجزیہ اور ان کا حل ہے لیکن ان کی نظر زندگی کے دیگر پہلوؤں پر بھی پڑتی ہے۔ قحط بنگال نے جو ہندوستانیوں پر مسلط کردہ تھا ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کو بے حد متاثر کیا اور انھوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ مخدوم نے بھی قحط کی بھیانک تصویر پیش کی ہے۔

بھوک کا بیماریوں کا بم کے گولوں کا شکار
پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پر سود خوار

انھوں نے فرنگیوں کے اس ظلم کے خلاف اپنے طور پر حل بھی پیش کیا۔

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کرسکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کرسکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بیدار کرسکتے ہیں ہم
زندگی سے ہند کو سرشار کرسکتے ہیں ہم

مخدوم نے ایک کمیونسٹ شاعر کی حیثیت سے سرمایہ داری پر بھرپور وار کیا ہے۔ ان کی دانست میں سطح ارض پر ساری مصیبت سرمایہ داروں کے ہاتھوں لائی ہوئی ہے اس لیے انھوں

نے سرمایہ داری کی بیخ کنی کا بیڑا اٹھایا۔ ان کی نظم ''زلف چلیپا'' سرمایہ داروں پر ایک بھرپور وار ہے۔

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام

آندھیاں شعلے بداماں خون کی برسات میں
اب تو بوئے آتش و بارود ہے ہر بات میں

کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرق گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج

موت محو شادمانی غرق ماتم ہے حیات
لٹ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات

ان اشعار میں انسان کی بے بسی اور بے کسی کی سچی تصویر دکھائی گئی ہے۔ ماؤں کی سہانی گودیوں کی ویرانی اور فرق گیتی پر کانٹوں کے تاج کا سبب سرمایہ داری ہے۔ اس کی نحوست سے ساری خلقت مٹ رہی ہے اور کائنات جل رہی ہے۔ یہ ساری نظم سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مخدوم کہتے ہیں کہ ہندوستان ہمیشہ سے ہی اخوت و محبت کا مسکن رہا ہے۔ یہاں رام، لچھمن، گوتم، حضرت محمدؐ اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات نے احترام آدمیت اور صلح و آشتی کا درس دیا ہے۔

جس زمیں سے ارتقا کے انبیاء پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے

رام و لچھمن کی زمیں کرشن کی گوتم کی زمیں
وہ محمدؐ کی زمیں وہ ابن مریم کی زمیں

مخدوم کو اس بات کا یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی سرمایہ داری کے پاؤں اُکھڑ جائیں گے اور دنیا میں امن وآشتی اور مساوات کا پرچم بلند ہوگا کیوں کہ انسانی شعور بیدار ہو چکا ہے اور وہ اب غلامی کے پنجوں میں کھیلنے کے لیے تیار نہیں۔

عزم آزادی سلامت ؟ زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو ، بغاوت زندہ باد

میکسم گورکی نے سماج اور انسانیت کی تباہ کاریوں سے نفرت کرتے ہوئے ایک پیام دیا تھا کہ ''ستم رسیدہ انسانیت کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ اور ایسی تمام پابندیوں کو فنا کر دیا جائے اور ایسا نظام بنایا جائے جو انسانیت کے مقاصد کی ترجمانی کرے۔'' مخدوم نے انسانیت کی بنیادی قدروں کو اپنا موضوع بنا کر حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی شاعری اور زندگی کا مقصد انسانی زندگی کو خوش حال بنانا اور ان کو دکھ، درد اور پریشانیوں سے نجات دلانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رومانی نظموں میں بھی سماجی کرب کا احساس ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں ہم اس دور کے سماج کو دیکھتے ہیں جو اخلاقی پستی اور بیمار ذہنیت کا شکار تھا۔ مخدوم کی سماج دوستی اور حقیقت نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے سبط حسن لکھتے ہیں:۔

''اس آٹھ سال میں ہماری سماج نے کتنی منزلیں طے کی ہیں، کتنے دوراہوں سے گزری ہے، کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں اور آج ذہنی پستی اور اخلاقی شکست کے کس گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ سوسائٹی کے اس کرب کو، اس بے چینی اور جدوجہد کو بڑے بڑے شاعر کا قلم بھی پوری قوت سے

بیان نہیں کر سکتا۔ لیکن مبارک ہیں وہ لوگ جن کے ہاتھ زمانے کی نبض پر رہے ہوں اور جو وقت کی رفتار تیز کرنے پر قادر نہ سہی لیکن اس سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتے ہوں، اس کے دل کی دھڑکن محسوس کرتے ہوں۔ اسی لیے تو مجھے تمھارے اشعار بہت پسند ہیں۔

.....لیکن ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمھاری شاعری عصر حاضر کے اضطراب اور احساس کی آئینہ دار ضرور ہے۔ تمھارے فنی شعور میں ہر جگہ سماجی شعور کی روح ضرور تڑپتی نظر آتی ہے۔''

(مکتوب سبط حسن از بساط رقص۔ص 9)

مخدوم کا یہ سماجی شعور ان کی رومانی نظم ''چارہ گر'' میں بھی نظر آتا ہے۔ اس میں ہندوستانی سماج کی عکاسی ہے جو دو محبت کرنے والوں کے ایک ہو جانے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

مخدوم نے بہت قریب سے ہندوستانی سماج کو انگریزوں کے آہنی شکنجہ میں سسکتا ہوا دیکھا تھا۔ انھوں نے سماج کے روز وشب کو بدلنے کی ٹھان لی۔ ''اندھیرا'' مخدوم کی ایک علامتی نظم ہے جس میں انھوں نے سماج کی سسکتی ہوئی آواز کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ بقول عزیز احمد ''یہ اندھیرا سرمایہ دارانہ نظام کا ہے جہاں ہر چیز مانگی ہوئی ہے۔''

(صبا۔ مخدوم نمبر۔ص 55)

رات کے ہاتھ میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اُجالے ہیں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن

اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تار میں اُلجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پہ وہ بیٹھے ہوئے گِدھ
وہ تڑپتے ہوئے سر
میتیں ہاتھ کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کہ اس پار سے اس پار تلک

اس نظم میں روح عصر کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم کسی ایک مخصوص جنگ کے خلاف نہیں ہے بلکہ جنگ کے خلاف ابدی صدائے احتجاج ہے۔ اس نظم کی تشریح سردار جعفری نے اس طرح کی ہے۔

''نظم کی جذباتی جڑیں جنگ کے اس سامراجی دور میں پائی جاتی ہیں جس میں قومی رہنماؤں کی ناکارہ سیاست اور برطانوی شہنشاہیت کی سخت گیری نے ہندوستان کو کچل دیا تھا۔ لیکن یہ نظم کہی گئی ہے اس دور میں جب روس پر جرمنی کے حملے سے جنگ کے حالات میں ایک انقلابی تبدیلی ہو چکی تھی اور دنیا کی سیاست نے ایک نئی کروٹ بدلی تھی۔ انسانیت کا قافلہ ایک نئے موڑ پر آ گیا تھا۔ ہندوستان میں قومی رہنما جیلوں سے رہا ہو رہے تھے

اور ملک کی فضاء میں عوامی جنگ کا نعرہ بلند ہو رہا تھا اور یہ سب محسوس کر رہے تھے کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے ایک طرف ترقی پسند قوتیں ہیں جن کی رہنمائی چین اور روس کر رہے ہیں دوسری طرف جاپان، جرمنی اور اٹلی کی رہنمائی میں دنیا کی بدترین رجعت پرستی ماضی کے ویرانوں اور کھنڈروں کو برقرار رکھنے کے لیے کیڑے مکوڑوں کی طرح امڈ رہی ہے۔''

(صبا۔ مخدوم نمبر۔ ص 65-64)

مخدوم کے یہاں زندگی کا گہرا شعور ہے۔ انھوں نے گذشتہ جاگیردارانہ نظام کے پس منظر میں تلخ سچائی کا اظہار کرتے ہوئے صداقت پر مبنی نظم ''حویلی'' لکھی۔ جاگیرداری نظام میں حویلی ایک علامت ہے۔ مخدوم نے حویلی کو علامت بنا کر فرسودہ سماج کی خرابیاں بیان کی ہیں۔

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر
جن میں رہتے ہیں مہاجن، جن میں بستے ہیں امیر
جن میں کاشی کے برہمن، جن میں کعبے کے فقیر
رہزنوں کا قصر شوریٰ، قاتلوں کی خواب گاہ
کھل کھلاتے ہیں جرائم، جگمگاتے ہیں گناہ
جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا، ایمان کا

روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں ، انسان کا

نظم کے پہلے حصے میں مخدوم نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کے اسباب کی نشاندہی کی ہے اور آخری حصے میں وہ اپنے مقصد کی طرف لوٹتے ہیں اور سماج کے اکثریتی طبقے یعنی کمزوروں اور مظلوموں کو برسرِ پیکار ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔

اے جواں سال جہاں ، جان جہان زندگی
ساربان زندگی روح روان زندگی
جس کے خون گرم سے بزم چراغاں زندگی
جس کے فردوسی تنفس سے گلستاں زندگی
بجلیاں جس کی کنیزیں زلزلے جس کے سفیر
جس کا دل خیبر شکن جن کی نظر ارجن کا تیر
ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی
تو بجائے ساز الفت اور گائے زندگی
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

مخدوم نوجوانوں اور کچلے ہوئے طبقے کا شعور جگانا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ آنے والے مستقبل کی چاپ سن رہے تھے کہ حویلی کھنڈر ہونے والی ہے اور وہ ان کھنڈروں پر آزادی کا پرچم لہرانے کے لیے کہتے ہیں۔

مخدوم اپنے عہد کا گہرا درک رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہوئے ضروری اور اہم سماجی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ پروفیسر سیدہ جعفر

لکھتی ہیں۔

''مخدوم کی نظموں حویلی ، زلف چلیپا اور مشرق میں ایک ایسی فضاء موجود ہے جو اس وقت تک اردو ادب کا جز و نہیں بنی تھی اس دور کے انقلابی لب ولہجہ اور سماجی شعور کی شاعری میں مخدوم کا اہم حصہ ہے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر محمد شجاعت علی راشد

ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج' مرکز برائے اُردو زبان' ادب وثقافت

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی' حیدرآباد

مخدوم ۔ لافانی شاعر

جب کسی قوم کی حالت پستی اور تنزل کے عبرت انگیز دور سے گزر کر تباہی و بربادی تک پہنچ جاتی ہے تو ایسی ہی قوموں کی رہبری و رہنمائی کے لیے ہر دور اور ہر زمانے میں پیامبر پیدا ہوئے ہیں جن کا پیام احساسات و جذبات کو جگا کر ایک ذہنی انقلاب کا محرک بنتا ہے۔ مخدوم بھی ایسے ہی پیمبران انقلاب میں سے ایک ہیں ؎

غلط آہنگ سازِ زندگی برباد ہوجائے
جہانِ نغمہ قید ساز سے آزاد ہوجائے

سرزمین حیدرآباد دکن کے اس سپوت کا پورا نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین حذری تھا خاندان کے بزرگ انھیں ''بابا'' کی عرفیت سے پکارتے تھے۔

مخدومؔ کی گھریلو زندگی سیدھی، سادی، قانع، مطمئن اور آسودہ تھی۔ وہ زندگی سے کبھی بھی شاکی نہیں رہے۔ مخدومؔ مذہب کو مسجد، مندر، گردوارہ اور گرجا سے ماورا دیکھنے کے قائل تھے۔ انھیں سچائی، نیکی، انسانیت اور مساوات کی تلاش تھی۔ اس لیے وہ ہر مذہب کا احترام

کرتے تھے۔ مخدوم طبعاً بذلہ سنج، شگفتہ مزاج اور زندہ دل شخص تھے۔

مخدومؔ کی باقاعدہ ملازمت کا آغاز 1939ء سے ہوتا ہے جب وہ سٹی کالج کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے اور دو برس تک بہ حیثیت استاد کارگزار رہے۔ 1940ء میں مخدومؔ کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری چنے گئے اور ان کی سیاسی مصروفیتیں بہت زیادہ بڑھ گئی جس کی وجہ سے انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور پارٹی کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے۔ جولائی 1943ء میں حیدرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ تشکیل مخدومؔ کی رہنمائی میں عمل میں آئی۔ یوں تو 1936ء اور 1938ء کے درمیان یہ تحریک اردو، ہندی اور بنگالی کے ادیبوں میں نہ صرف مقبول ہوچکی تھی بلکہ اپنی جڑیں بھی پھیلا رہی تھی۔ مخدومؔ نے حیدرآباد میں اس تحریک کو ایک شکل دی اور سبط حسن نے اس کے لیے راہ ہموار کی۔ عزیز احمد، ابراہیم جلیس، سلیمان اریب، شاہد صدیقی، سری نیواس لاہوٹی، نیاز حیدر اور عالم خوندمیری وغیرہ مخدومؔ سے متاثر ہوکر اس تحریک سے وابستہ ہوگئے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس 1945ء میں مخدومؔ کی کوششوں سے حیدرآباد میں منعقد ہوئی۔ اس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سروجنی نائیڈو، قاضی عبدالغفار، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر تاراچند، فراق گورکھپوری' سید احتشام حسین اور کرشن چندر نے اس میں شرکت کی تھی۔

مخدومؔ ابتداء ہی سے سبھاش چندر بوس اور پنڈت نہرو سے متاثر تھے۔ فاشزم کے خلاف ان رہنماؤں کے خیالات نے مخدومؔ کی ذہنی فضا میں ہل چل مچادی تھی۔ مشہور رسالے ''نگار'' اور ''ایوان'' نے مخدومؔ کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی۔ خصوصاً نیاز فتح پوری کی تحریریں مخدومؔ کی سوچ کا جواز بنتی گئیں۔ اس زمانے میں مخدومؔ کے ذہنی افق پر کئی

تصویریں تیزی سے ابھر رہی تھیں۔ عالمی سرمایہ داری کا بحران جو 1929ء سے 1933ء کا زمانہ ہے۔ 1937ء میں یہ بحران اپنے عروج پر تھا۔ یہی زمانہ مخالف سامراج جدوجہد کی نئی سمت کی طرف اشارے کرتا ہے۔ ملک کے نوجوانوں اور محنت کشوں میں بائیں بازو کے رجحانات آگ کی طرح پھیل رہے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی جو 1927ء میں قائم ہوچکی تھی۔ مزدوروں اور کسانوں کو جہد وعمل کا درس دینے میں مشغول تھی۔ اسی عرصہ میں کامریڈ اسوسی ایشن کا قیام (1939ء) عمل میں آیا جس کے میر کارواں مخدومؔ تھے۔ اس اسوسی ایشن کی بنیاد آزادی، جمہوریت اور سوشلزم پر تھی۔ اسی سال دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ نظام حیدرآباد نے اس جنگ کی حامی بھری۔ کامریڈ اسوسی ایشن نے اس رویہ کو سخت ناپسند کیا۔ 1939-40 میں مخدومؔ کی سرکردگی میں اسٹوڈنٹس یونین کی تشکیل عمل میں آئی۔ یہ یونین آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ملحق ہوکر آل حیدرآباد اسٹوڈنٹس یونین کہلائی جانے لگی۔

1942ء سے 1946ء تک کا زمانہ ریاست حیدرآباد میں ایک انتشار کا دور رہا ہے۔ شہر میں ٹریڈ یونین تحریک اور اضلاع میں کسان تحریک تیزی سے پھیلنے لگی۔ تلنگانہ میں کسان تحریک نے لگان اور ٹیکس کے خلاف شدت سے آواز بلند کی۔ آندھرا مہاسبھا نے اس تحریک کی قیادت کی۔ پارٹی نے ٹریڈ یونین کے ذریعہ تمام مزدوروں کو یکجا کیا جن کا تعلق ریلوے، آلوین میٹل ورکس، کپڑے اور سگریٹ کے کارخانوں سے تھا۔ مکان تعمیر کرنے والے مزدور، پریس اور ہوٹل میں کام کرنے والوں کے علاوہ رکشہ چلانے والے بھی ٹریڈ یونین سے وابستہ ہوگئے۔ صنعتی اداروں کے علاوہ سرکاری ملازمین کی ٹریڈ یونین بھی قائم ہوگئی۔ جیسے محکمہ برقی، پی ڈبلیو ڈی، میونسپل کارپوریشن وغیرہ۔ ان ہی دنوں مخدومؔ کی سرپرستی میں اسکول ٹیچرس کی ٹریڈ یونین بھی قائم ہوئی۔ ٹریڈ یونین نے ریاست کے پرانے شہر کے

ملازمین اور مزدوروں میں توانائی اور جدوجہد کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ پرانے شہر کے محنت کش طبقے نے خاص طور پر اس کا اثر قبول کیا تھا۔

11 ستمبر 1947ء کو کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں روی نارائن ریڈی، بی یلا ریڈی اور مخدومؔ نے ایک بیان جاری کیا کہ ''جدوجہد کو تیز کرنے کے لیے ہتھیار اٹھالو''۔ اس بیان کے بعد نظام سرکار کے خلاف مسلح جدوجہد کا زور وشور سے آغاز ہوا۔ 24 اپریل 1951ء میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور مئی 1951ء میں مخدومؔ کو گرفتار کرلیا گیا اور عام چناؤ سے پہلے 1952ء میں مخدومؔ اور دوسرے کامریڈ رہا کردیے گے تاکہ الیکشن میں حصہ لے سکیں۔ مخدوم اسمبلی اور پارلیمنٹ دونوں کے لیے امیدوار تھے باوجود اپنی مقبولیت کے الیکشن میں کوئی نشست حاصل نہیں کرسکے۔ 1956ء میں پارٹی نے انھیں قانون ساز کونسل کے لیے اپنا امیدوار بنایا اور ایم ایل سی بننے کے بعد مجلس قانون ساز آندھرا پردیش میں اپوزیشن لیڈر منتخب ہوئے اور کونسل میں کمیونسٹ پارٹی کے قاید کی حیثیت سے تادم مرگ کارگزار رہے۔

مخدومؔ ایک مشاعرے کے سلسلے میں دہلی گئے ہوئے تھے۔ وہیں 25 اگست 1969ء کی صبح ان کا انتقال ہوا۔ ان کی میت حیدرآباد لائی گئی اور یہیں حضرت شاہ خاموش کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ ان کی لوح مزار پر ان ہی کا یہ شعر کندہ ہے۔

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

مخدومؔ نے 33-1932 کے آس پاس شاعری شروع کی۔ یہ ان کی طالب علمی کا دور تھا۔ پہلا مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' 1944ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ 1961ء میں گل تر کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ ''بساط رقص'' تیسرا مجموعہ کلام ہے۔ یہ 1966ء میں

شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں سرخ سویرا اور گل تر کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ 1966ء تک کا تمام دستیاب کلام ہے۔ مخدومؔ کے پہلے مجموعہ سرخ سویرا کا انتساب ہے محبت اور محنت کے نام۔ یہ انتساب مخدوم کے ذہنی رویے اور رجحانات کی عکاسی کرتا ہے کہ شاعر اگر دھڑکتے دلوں کا نبّاض ہے تو محنت کش طبقہ کا ترجمان بھی ہے۔ اس کی شاعری میں حیات بھی ہے اور کائنات بھی۔ مخدومؔ اپنے ساتھ سارے زمانے کو لے کر چلنا چاہتے ہیں۔ ''سرخ سویرا'' کی پہلی نظم ''طور'' ایک رومانی نظم ہے۔ مخدوم کے رومان کا آغاز کھیتوں میں پانی کے کنارے سے ہوتا ہے۔ یہ نظم اسی تجربے اور کیفیت کی ترجمان ہے۔

یہیں کی تھی محبت کے سبق کی ابتدا میں نے
یہیں کی جرأت اظہار حرف مدعا میں نے
یہیں دیکھے تھے عشوے ناز و انداز حیا میں نے
یہیں پہلے سنی تھی دل دھڑکنے کی صدا میں نے
یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی

یہ نظم ہر اس نوجوان کی قلبی کیفیت کی مظہر ہے جس نے عشق کیا۔ اس نظم میں عشق کی پاکیزگی کو اجاگر کیا گیا ہے۔

خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے

مخدومؔ کی رومانی نظموں میں بھی تطہیر کا عنصر ملتا ہے۔ یہ نظمیں محبت کے سیدھے سادے فطری اور والہانہ جذبات کی تصویریں ہیں جن سے ان کی حسن پرستی ظاہر ہوتی ہے۔ ساگر کے کنارے تلنگن، انتظار اور وہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ نظم انتظار کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

رات بھر دیدۂ نم ناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
خوش تھے ہم اپنی تمناؤں کا خواب آئے گا
اپنا ارمان برافگندہ نقاب آئے گا
شب کے جاگے ہوئے تاروں کو بھی نیند آنے لگی
آپ کے آنے کی اک آس تھی اب جانے لگی
صبح نے سیج سے اٹھتے ہوے لی انگڑائی
او صبا تو بھی جو آئی تو اکیلی آئی
میرے محبوب میری نیند اڑانے والے
میرے مسجود میری روح پہ چھانے والے
آ بھی جا تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا تاکہ ترے قدموں پہ مری جان نکلے

یہ ایک دل کش نظم ہے اس میں شکست آرزو کا ہلکا سا رنگ بھی شامل ہے۔ بقول سیدہ جعفر ''مخدومؔ کے تمام نقادوں نے ان کی رومانی شاعری اور ان کے ابتدائی کلام میں ان کی شخصیت کے نقوش تلاش کیے ہیں اور ان کا تجزیہ کر کے ان کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔'' سلام مچھلی شہری مخدومؔ کی رومانی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں ''ان کی رومانی شاعری کے پیچھے جو سماجی کردار ہے وہ بڑا ہی متحرک، فعال اور حسین کردار ہے۔ اس کردار کی فعالیت ان کی رومانی شاعری کو خوابنا کی نہیں دیتی بلکہ ایک بیداری بخشتی ہے۔''

(مخدوم محی الدین ایک تاثر صبا۔ مخدوم نمبر)

حقیقت یہ ہے کہ مخدوم کی شاعری کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ مخدوم ایک مسلسل انتظار کی لذتیت میں محو ہیں۔ یہ انتظار اپنے محبوب کا بھی ہے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کا بھی۔ بقول ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ''مخدوم نے دیکھا کہ ''محنت اور محبت'' دونوں ہی محرومیوں سے دست و گریبان ہیں اور ایک خوش آئند مستقبل کے لیے پیہم جدوجہد میں مصروف ہیں بس یہی خیال مخدوم کی زندگی اور مخدوم کی شاعری دونوں کا مرکزی نکتہ ہے۔''
(بساطِ رقص)

مخدومؔ کا جذبہ عشق آگے بڑھتے ہوئے انقلاب کی تمنا بن جاتا ہے۔ باغی اور جنگ ایسی نظمیں ہیں جس میں انقلاب کی ایک ہل چل نظر آتی ہے تو نظم ''مشرق'' میں اپنے ماحول سے بے زاری اور غلامی سے نفرت کا اظہار ملتا ہے۔

جہل ، فاقہ ، بھیک ، بیماری ، نجاست کا مکان
زندگانی ، تازگی، عقل و فراست کا مسان
وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
- - - - - - - - - - - - - - - - - - -
اک مسلسل رات جس کی صبح ہوتی ہی نہیں
خواب اصحابِ کہف کو پالنے والی زمیں

مخدومؔ ہندوستان اور دنیا بھر کے بدلتے ہوئے سیاسی ، سماجی ، اقتصادی اور ادبی حالات سے شعوری طور پر متاثر ہو رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سماج میں جو کرب ، گھٹن ، اضطراب ، نا آسودگی اور مصائب و آلام ہیں وہ دراصل سرمایہ دارانہ نظام کی دین ہیں جس

کی وجہ سے ماؤں کی گودیں سونی ہو رہی ہیں۔ ان کے سہاگ اجڑ رہے ہیں۔ کائنات دہک رہی ہے اور دنیا تباہ ہو رہی ہے۔

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام
اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام
کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرق گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج
موت محوِ شادمانی ، غرق ماتم ہے حیات
لڑ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات
(زلف چلیپا)

مخدومؔ انسان کے ہاتھوں انسانوں کے استحصال سے مغموم ضرور ہیں لیکن مایوس نہیں۔ انھیں یقین ہے کہ سرمایہ دارانہ استحصالی نظام بہت جلد ختم ہو جائے گا اور دنیا میں امن وچین اور عدل و مساوات کا راج قائم ہوگا۔ انھیں انقلاب کا انتظار ہے جس کے بعد ''اس زمین موت پروردہ'' کو ڈھایا جائے گا اور ایک نئی دنیا اور ایک نیا آدم بنایا جائے گا۔ مخدومؔ ایک نئی صبح کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں اور اپنے ہم وطنوں کو آواز دیتے ہیں۔

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

جنگ آزادی کے موضوع پر ان کی نظم ''جنگ آزادی'' ایک سیدھی سادھی نظم ہے لیکن اپنی

نغمگی کے باعث یہ مخدومؔ کی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ نظم درحقیقت آزادی کے متوالوں کا ترانہ ہے۔

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

''چاند تاروں کا بن''، مخدومؔ کی مشہور نظم ہے۔ مخدومؔ نے نظم کے عنوان کے ساتھ ذیلی عنوان بھی دیا ہے آزادی سے پہلے' بعد اور آگے اس طرح مخدومؔ خود ہی نظم کو تین حصوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ یہ نظم جدوجہد آزادی کی الم ناک داستان ہے۔ آزادی جس کے حصول کے لیے بے شمار لوگوں نے قربانیاں دیں اور جب آزادی ملی تو سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ایک طرف آزادی کا جشن منایا جا رہا تھا تو دوسری طرف فرقہ وارانہ فسادات اور مذہبی جنون نے بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کروڑوں کی املاک تباہ ہوئی۔ عورتوں اور معصوم بچوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی یہ آزادی نہیں تھی۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن

تشنگی تھی مگر
تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم' مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن
رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

اس نظم کے اختتام پر مایوسی کے بجائے ایک عزم اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی مخدومؔ کی انفرادیت ہے۔

تلملچھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے
رات کی
صبح کا کچھ اجالا، اجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

مخدوم کی اس نظم کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں۔

''غالباً ترقی پسندوں میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے آزاد نظم لکھنے کی جرأت کی ورنہ اس وقت تک آزاد نظم کو زوال کی علامت سمجھا جاتا تھا۔''

اس نظم کی شعریت وموسیقیت پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر شاذ تمکنت لکھتے ہیں۔

''.....اس نظم کو پُر تاثیر بنانے میں فکر کے خلوص کے ساتھ ساتھ وہ صوتی آہنگ ہے جس سے نظم قاری کے ذہن کو شعریت وموسیقیت کے ہالے میں لے لیتی ہے۔ نظم کے ابتدائی مصرعے ملاحظہ ہوں۔

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگا تا رہا چاند تاروں کا بن

تن، وطن، بن ان تینوں مصرعوں کے ہم وزن ارکان نے ایک فضاء قائم کردی ہے۔ قوافی میں حرف ''ن'' کی غنائیت قابل غور ہے۔'' ڈاکٹر عالم خوندمیری نے اس نظم کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔

مخدومؔ نے جہاں رومانی اور انقلابی مضامین کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے وہیں شخصیات پر بھی انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ اگر ولی، اقبال اور غالب پر نظمیں ملتی ہیں تو اسٹالین، لومبا، نہرو اور مارٹن لوتھر سے دلی وابستگی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ان کے علاوہ دو تہذیبی کردار ''بھاگ متی'' اور ''گگارن'' بھی ملتے ہیں جنھیں مخدوم نے سراہا ہے۔

''گل تر'' میں مخدومؔ نے ''پڑھنے والوں سے'' کے زیر عنوان اپنی شخصیت اور شاعری کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور لکھتے ہیں کہ ''انسان میں عمر، وقت اور تجربے کے ساتھ ساتھ ایک نیا پن پیدا ہوتا رہتا ہے جو سماجی اور شعوری ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے۔ آگے چل کر مخدوم لکھتے ہیں زماں ومکاں کا پابند ہونے کے باوجود شعر بے زماں ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔..... تہذیب انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ جمالیاتی حسن انسانی حواس کی ترقی اور نشوونما کا دوسرا نام ہے۔ اسی جمالیاتی حسن نے مخدوم کو غزل گوئی کی طرف مائل

کیا۔ ''گل تر'' کا تقریباً نصف حصہ اسی صنف پر مشتمل ہے۔ مخدوم نے غزل کی روایات کا احترام کرتے ہوئے اسے فکر کی نئی جہتوں سے روشناس کیا۔ مخدوم کی غزل کے تعلق سے سیدہ جعفر رقم طراز ہیں۔

''لب و لہجے اور پیرایۂ اظہار کے اعتبار سے مخدوم کی غزلوں میں بڑی گھلاوٹ اور رچاؤ کا احساس ہوتا ہے۔..... مخدوم نے اپنی غزلوں میں تلخی دوراں کو غم جاناں میں گھول کر اسے اس طرح داخلی زندگی کا خوب صورت تجربہ بنا دیا ہے کہ غزل کے سانچے میں غم ایام اور محبت کی واردات کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔''

یہاں غزلوں کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

بکھری ہوئی رنگیں کرنوں کو آنکھوں سے چرا کر لاتا ہوں
فطرت کے پریشاں نغمے سے پھر اپنا گیت بناتا ہوں
قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے دم شعلہ ساز ساتھ رہے

ان غزلوں میں ایک سرور وانبساط کی کیفیت ملتی ہے غنائیت مخدوم کی شاعری کی ایک اہم صفت ہے۔ مخدوم اپنی غزلوں میں ایسے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں جس سے ایک سحر آفرین فضا طاری ہوجاتی ہے۔

دھڑک گئے ہیں کبھی دل کبھی جھکی ہے نظر
کہاں چھپا ہے کسی سے کسی کی چاہ کا رنگ
چمن کی آنکھ بھر آئی کلی کا دل دھڑکا
لبوں پہ آتی ہے جب بھی کسی قرار کی بات
زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی، زندگی رنگ وگل کا بیاں دوستو

گاہ ہنستی ہوئی، گاہ روتی ہوئی، میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی
یہ مہکتی ہوئی غزل مخدومؔ
جیسے صحرا میں رات پھولوں کی

ترقی پسند شاعری میں تشبیہہ، استعارے اور علامات کے ذریعہ گفتگو کرنے کا جو عام رواج تھا مخدومؔ نے بھی اسی روش کو اپنایا۔ مخدومؔ کے ہاں عصری حسیت غزل کی علامتوں اور استعاروں میں ڈھل گئی ہے۔ ان کی غزلوں میں سماجی آگہی اور تہذیبی شعور تغزل کے عناصر میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اس کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں جس میں ترقی پسندی اور کلاسیکی روایات کو مخدومؔ نے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

اُٹھو کہ فرصتِ دیوانگی غنیمت ہے
قفس کو لے کے اڑیں گل کو ہمکنار کریں
کوئی جلتا ہی نہیں ، کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے
دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے

مخدومؔ کی شاعری کے بارے میں علی جواد زیدی لکھتے ہیں۔

''مخدوم کی ترقی پسندی کا خمیر اردو کی بہترین ادبی روایات سے بنا ہوا ہے۔ زبان و بیان کا رچاؤ اظہارِ خیال و جذبات کی سنبھلی ہوئی اور متوازن کیفیت ،

طریقہ اظہار کی صناعانہ شگفتگی، ترقی پسندانہ سادگی کی پرکاری، ماضی سے سوچی سمجھی بغاوت ، حال سے تعمیر پسندانہ وابستگی و ناآسودگی ، مستقبل پر والہانہ اور رجائی یقین، دنیا کی جمالیاتی قدروں کا فن کارانہ احساس اور زندگی کے غم جھیلنے اور زندگی کو اچھی طرح پرکھنے کا حوصلہ، عناصر ترکیبی مخدوم کی شاعری کو عام ترقی پسندوں کی شاعری سے ممتاز کر دیتے ہیں۔''

یوسف ناظم ''سدا بہار مخدومؔ'' میں رقم طراز ہیں۔

مخدومؔ بڑی ملٹی پرپز قسم کی اشیاء میں سے ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور لیڈر بھی۔ عاشق بھی ہیں اور محبوب بھی۔ خادم بھی ہیں اور مخدوم بھی۔ وہ اس ڈپارٹمنٹل اسٹور کی طرح ہیں جس میں ہر شخص کو اپنے مطلب کا سامان مل جاتا ہے۔ شاعر کی حیثیت میں مخدومؔ قدیم اور جدید کے درمیان کی کڑی معلوم ہوتے ہیں۔''

مخدومؔ کی زندگی کا اگر مطالعہ کریں تو ان کی زندگی میں اور شاعری میں تضاد نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم اردو کے ان شعراء میں سے ایک ہیں جو مصلحت اور خود پرستی سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ مارکسی اور اشتراکی نظریہ کے حامل ہونے کے باوجود وہ کردار و گفتار کے ذریعہ متضاد باتوں یا منفی خیالات و جذبات کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ حقیقی مسائل اور فطری تقاضوں کا شاعرانہ اظہار ہی ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے جس میں سادگی، معصومیت، کشادہ ذہنی ملتی ہے۔ شاید اسی وجہ سے ایک رومانی شاعر انقلابی شاعر میں تبدیل ہوگیا۔ مخدومؔ کی انقلابی سرگرمیوں کے باعث 1946ء میں انھیں گرفتار کرنے کا حکم جاری ہوا۔ اور مخدومؔ روپوش ہوگئے۔ بعد میں انھیں ایک جلسہ میں گرفتار کرلیا گیا چند دن بعد ضمانت پر رہا ہوئے۔ اس طرح قید و بند کا سلسلہ چلتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام دوسرے ترقی پسند شعراء کے مقابلے میں نسبتاً کم ہے۔ اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ مخدوم نے نثر میں بھی اپنی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ مخدوم نے ڈراما، مختصر افسانہ اور مضامین بھی لکھے۔ مخدومؔ نے

اپنے زمانہ طالب علمی میں اداکاری سے شغف کی بناء پر اسٹیج پر پیش کرنے کے لیے ڈرامے لکھے۔ان کے تین ڈراموں میں سے دو ڈرامے انگریزی اور روسی زبان سے ماخوذ ہیں اور ایک ڈراما طبع زاد ڈراما ہے۔مخدومؔ نے ایک مقالہ بھی ''اردو ڈراما اور اسٹیج'' کے زیرعنوان سپردِقلم کیا ہے۔مخدومؔ کو ڈرامانگاری اور اداکاری سے فطری لگاؤ تھا۔ ''ہوش کے ناخن'' برنارڈشاہ کے ڈرامے Widower's House سے ماخوذ ہے۔یہ ڈراما مخدومؔ نے اپنے دوست میرحسن کے تعاون سے لکھا تھا۔ہوش کے ناخن کو اسٹیج کرنے کے بعد اہلِ حیدرآباد کی تعریف وتوصیف نے مخدومؔ کی حوصلہ افزائی کی اور انھوں نے ایک طبع زاد ڈراما ''مرشد'' قلم بند کیا۔یہ ڈراما بزم ڈراما جامعہ عثمانیہ کی جانب سے 1935ء میں اسٹیج کیا گیا تھا۔مخدومؔ کا ایک اور ڈراما ''پھول بن'' ہے جسے انھوں نے چیخوف کے ڈرامے ''چیری آرچرڈ'' سے اخذ کرکے اردو کا جامہ پہنایا تھا۔ڈرامانگاری کے علاوہ مخدومؔ نے مختصر افسانے بھی لکھے۔ان کا پہلا افسانہ ''پھول اور پتھر'' ہے جو 1930ء میں لکھا گیا۔اس کے علاوہ آدم کی اولاد اور پاپن وغیرہ افسانے لکھے۔ ''بگھی کے پیچھے چھوکرا''۔یہ شگفتہ طرز میں لکھے ہوئے ہلکے پھلکے دس مضامین ہیں۔مخدومؔ کے ان کارناموں کو دیکھتے ہوئے اگر ہم یہ کہیں تو مبالغہ آرائی نہیں ہوگی کہ مخدومؔ تو ہر انسان کی طرح ایک فانی انسان ہی تھے لیکن ان کا کلام لافانی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عسکری صفدر
ریڈر وصدر شعبۂ اُردو، حسینی علم گرلز ڈگری کالج، حیدرآباد

مخدومؔ کا شعری تخیّل دورِ جدید کا نبّاض

مخدومؔ محی الدین اُردو ادب کا ایسا آفتاب ہے جو ارضِ دکن سے طلوع ہوا' ایشیا کے اُفق پر تابناکی سے چمکتا رہا اور چمکتا رہے گا۔

مخدومؔ کی زندگی کے تین اہم پہلو ہیں۔ٹریڈ یونین لیڈر، سیاسی رہنما اور ترقی پسند شاعر۔اس حیثیت سے مخدومؔ نے اپنی تمام زندگی محبت، محنت اور جدوجہد میں گذار دی۔ مخدومؔ محی الدین اردو ادب، سیاسی انقلاب اور حیدرآبادی تہذیب کے علم بردار تھے۔وہ بے حد ذہین تھے بلکہ انھیں عبقری اور حرکیاتی شخصیت کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔اُن کا مشاہدہ اور شعورِفکر بہت تیز وتند تھا۔

مخدومؔ کو بچپن کے سخت مذہبی ماحول نے کمیونزم کی طرف مائل کیا۔کمیونزم کی صداقت اور حق پسندی پر انھیں کامل بھروسہ تھا۔وہ مارکسی خیالات رکھنے کے باوجود دوسروں کے خیالات کا احترام کرتے تھے۔بےلوث سیاسی لیڈر، مزدوروں، کسانوں کے مسیحا' عالمی امن کے حامی اور انقلابی افکار اور بلند تخئیل کے باعث مخدومؔ نے تمام دنیا کے انسانوں کو اس الہامی شعر کا پیام دیا جو ضرب المثل بن گیا جس کی گونج سارے عالم میں سنائی دینے لگی۔ سچ

ہے کلام کی اثر آفرینی بڑے شعراء کے سوا کسی کی تابع نہیں ہوتی اور یہی خوبی اُنھیں حیاتِ جاودانی عطا کرتی ہے۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

بقول مخدومؔ 15 برس کی عمر تک انھوں نے دیوان حافظؔ، سکندر نامہ، دیوانِ صائبؔ اور شیخ سعدی کی گلستان و بوستان ختم کر لی۔ کالج میں کلاسیکل ادب سے دل چسپی لی اور جامعہ عثمانیہ میں 1933ء میں اپنی پہلی مزاحیہ نظم ''پیلا دوشالہ'' سے شاعری کا آغاز کیا۔ مخدومؔ ایک کامیاب ڈرامہ نگار' ہدایت کار اور اداکار بھی تھے۔ ڈرامے لکھے اور ڈراموں میں کردار بھی نبھائے۔ ڈراموں کے علاوہ نثر میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کا مختصر نثری سرمایہ بھی قابل قدر ہے۔

ایم اے کرنے کے بعد ٹیوشن لیے اور کلرک کی ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد 1939ء میں سٹی کالج میں لکچرر مقرر ہوئے۔ یہ ملازمت بھی 1943ء میں ترک کردی۔ 1940ء سے وہ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہو چکے تھے۔ وہ حیدرآباد میں کمیونسٹ پارٹی، ٹریڈ یونین تحریک کے علاوہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے تھے۔ مخدومؔ نے امیرؔ عارفی کے انٹرویو میں بتایا تھا کہ ترقی پسند تحریک سے حیدرآباد کا ادبی ماحول متاثر ہوا۔ جن میں نظرؔ حیدرآبادی، سلیمان اریبؔ، میکشؔ، ظہیر بابر، لطیفؔ ساجد، تحسینؔ سروری اور عزیز قیسی وغیرہ بھی متاثر ہونے والوں میں شامل تھے۔

مخدومؔ کی شخصیت ہمہ جہتی اور حرکیاتی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی پر امتناع کی وجہ سے انھیں جیل بھی جانا پڑا۔ ٹریڈ یونین لیڈر پہلے ہی بن چکے تھے۔ آزادی کے بعد 1952ء میں

الیکشن میں حصہ لیا۔ لیکن ناکام رہے۔ پھر اُسی سال ضمنی الیکشن میں حضور نگر یا حضور آباد سے اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔ 1956ء سے پارٹی کی طرف سے ایم ایل سی منتخب ہو کر اپوزیشن لیڈر رہے۔ آخر تک ایم ایل سی رہے۔

مخدومؔ ترقی پسند تحریک میں اپنی پوری شعوری قوت سے وابستہ ہوئے اور جذبوں پر اپنے شعور کے غلبہ کی بنا پر ''جنگ''، ''مشرق''، ''موت کا گیت''، ''اندھیرا''، ''دھواں'' اور ''چاند تاروں کا بن'' جیسی نظموں کو تخلیق کیا۔ اُن کی شاعری ہر طرح کے سرمایہ دارانہ نظام اور جبر و تسلط کے خلاف صدائے احتجاج بنی۔ شعر و ادب کی دنیا میں ضمیر کی آواز جسے ہر حساس انسان نے اپنے شعور کے مطابق قبول کیا۔ مخدومؔ نے اپنی نظم ''حویلی'' 1942ء میں گرائجویٹ کانفرنس میں سنائی۔ سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدرآباد بھی موجود تھے۔ اس کے بعد مخدومؔ پر عوامی جلسوں میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی گئی۔

نظم ''موت کا گیت'' میں مخدومؔ کی مذہب بیزاری اس لیے دکھائی دیتی ہے جتنا مذہب کی آڑ میں انسانیت کو پارہ پارہ کیا گیا، انسانوں کا خون بہایا گیا، جس طرح عام انسان کا استحصال کیا گیا۔ اس کی مثال نہیں ملتی۔ مثلاً

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خون انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دِگرگوں کردیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں
ظلمت ِ کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں

سگ خوں خوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
دشمنِ جاں کو نگہبان نہیں کہتے ہیں
جاگ اٹھنے کو ہے اب خوں کا تلاطم دیکھو
ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو

اس نظم ''موت کا گیت'' میں مخدوم کی نبض شناسی کمال پر پہنچتی ہے۔ اس نظم میں وہ بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ مخدومؔ نے حالات کے آئینے میں مغرب کی اِجارہ داری مشرق پر پہلے ہی دیکھ لی تھی۔ نظم ''مشرق'' کے حالات کل بھی وہی تھے۔ منظر نامہ ویٹ نام کا تھا۔ آج بھی وہی حالات ہیں۔ آج عراق و افغانستان اور فلسطین کے بارے میں بھی شاید مخدومؔ یہی کہتے کہ.....

ایک ننگی نعش بے گوروکفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی

نظم ''دھواں'' میں سامراجی نظام، آمرانہ تسلط، جاگیردارانہ نظام کی عدم مساوات، کمزوروں کے استحصال پر مخدومؔ نے طنز کی کاری ضرب لگائی۔ ادھر چند سالوں سے کسانوں کے قرضے تلے بوجھ سے خودکشیوں پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

خونِ دہقاں میں امارت کے سفینے تھے رواں
ہر طرف عدل کی جلتی ہوئی میّت کا دھواں

ایک نیا جہاں بنانا مخدومؔ کا ذاتی خواب بھی تھا اور انسان کے لیے پیغام بھی۔

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا جہان جس کا اُخوت پیام ہو

ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
ایسے جہانِ نو کا تو پروردگار بن

''زلف چلیپا'' مغربی استعماریت کے خلاف احتجاج ہے۔ اس میں مخدومؔ نے ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی آزادی کا اشارہ دیا ہے۔ مغربی بربریت کی اس دور میں ابتداء تھی۔ عصرِ حاضر میں یہ انتہا کو پہنچ گئی۔ نظم ''انقلاب'' مخدومؔ نے سٹی کالج کی لکچرر شپ کے دور میں لکھی تھی۔ انقلاب کی طرح مخدومؔ کی مشہور نظم ''اندھیرا'' بھی تہہ در تہہ نظم ہے۔ مخدومؔ کی نبض شناسی کی داد دینا چاہیے۔ یہ نظم ماضی کے پس منظر میں حال بھی بتاتی ہے۔ آئندہ آنے والے حادثوں مثلاً دہشت گردی، انسانی بموں کی بہتات، بموں کے دھماکے جیسے ہولناک منظر بھی دکھاتی ہے۔ ''اندھیرا'' کے لفظوں سے کما حقہ، ظاہر ہے۔ وہ رات کو جبر و تسلط، سرمایہ داری سے تعبیر کرتے ہیں اور صبح کو انقلاب سے۔

نظم ''قید'' مجموعہ گُل تر کی ایک تہہ در تہہ نظم ہے۔ سادگی میں رمز و کنایہ پنہاں ہیں۔ نہ جانے کیوں یہ نظم ن۔م۔ راشد کی مشہور آزاد نظم ''دریچے سے'' کی یاد دلاتی ہے۔

جاگ اے شمعِ شبستان وصال
محفلِ خواب کے اس فرش طرب ناک سے جاگ
لذّتِ شب سے ترا جسم ابھی چُور سہی
.....آ مری جان مرے پاس دریچے کے قریب

''چاند تاروں کا بن'' 1958ء میں لکھی گئی مخدومؔ کی مشہور اور اہم نظم ہے جو معنویت اور آفاقیت سے بھرپور ہے اور آئندہ کے لیے پیغام بھی۔ جس میں ملک کے حالات کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ نظم اپنے

تغزل، ترنم ونغمگی کے ساتھ طنز میں ڈوبی ہوئی ہے۔اس طرح شاعر نبض شناس بن گئے۔اس ضمن میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں۔

''اس مختصر نظم کے تینوں حصے کم سے کم جگہ میں بہت سے حقائق کو سمیٹ لیتے ہیں اور اندھیروں سے گزرتے ہوئے مستقبل پر نگاہ جماتے ہیں۔اس نظم کے لفظ لفظ میں علامتی تاثر اور فکری گہرائی نے نئی قوت پیدا کردی۔ بیرونی سیاست نے آزادی کی اس روشنی کو تاریکی میں کس طرح بدل دیا۔اس کا لطیف بیان اظہار کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

(ہم صغیر انقلاب مخدومؔ ص 85)

کچھ امامانِ صد فکر وفن
ان کی سانسوں میں اُفعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں
خونِ نورِ سحر پی گئے

نظم کے اس بند پر گجرات کے فسادات کا عکس نظر آتا ہے۔جس طرح مخدومؔ نے گجرات کی کالی رات کا اندازہ اپنے سیاسی، سماجی اور ادبی شعور سے کرلیا ہو۔نظم ''درۂ موت'' ویٹ نام کے پس منظر میں لکھی گئی۔موجودہ دور کے عراق وافغانستان کی تباہ وبربادی کا پرتو ہے۔

مخدومؔ ایک عظیم شاعر حساس و دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔وہ جنگ سے شدید نفرت کرتے تھے۔جنگ کی ہولناکیوں سے بنی نوع آدم کو محفوظ دیکھنے کی بصیرت افروز

کوشش نے نظم ''جنگ'' تخلیق کی۔اس کے علاوہ اس دکھ کو اس نظم میں انھوں نے اس طرح پیش کیا۔

جانے والے سپاہی سے پوچھو
وہ کہاں جارہا ہے

میں قلم بند کیا اور اسے فلم ساز بمّل رائے نے اپنی فلم ''اُس نے کہا تھا'' کے لیے منتخب کیا۔اس کے علاوہ مخدومؔ کی مشہور نظم ''چارہ گر'' کو فلم ساز چندر شیکھر نے اپنی فلم ''چاچا چا'' میں پیش کیا۔

مخدومؔ کے یہاں جمال پرستی پائی جاتی ہے۔اُن کی نظموں اور غزلوں میں جو پیکر تراشی، حُسن اور پُرکاری سموئی ہوئی ہے جسے انقلابی اور احتجاجی نظموں میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔مخدومؔ نے اپنے عمیق مشاہدے کی مدد سے حُسن کی مصوری اور پیکر تراشی کو بڑی چابک دستی سے نظم ''جوانی'' میں پیش کیا جو سراپا نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

بھرنے لگے بازو تو ہوئے بند قبا تنگ
چڑھنے لگا طفلی پہ جوانی کا نیا رنگ
ساغر کی کھنک بن گئی اُس شوخ کی آواز
بربط کی ہوئی گدگدی یا جاگ اٹھے ساز
اعضاء میں لچک ہے تو ہے اک لوچ کمر میں
اعصاب میں پارہ ہے تو بجلی ہے نظر میں
آنے لگی ہر بات پہ رُک رُک کے ہنسی اب
رنگین تموّج سے گراں بار ہوئے لب

مخدوم کی نظموں میں تغزل، نغمگی اور صوتی آہنگ موجود ہے۔ نظموں کے اکثر اشعار بے حد مشہور و مقبول ہوئے مثلاً

ہم نے ہنس ہنس کے تری بزم میں اے پیکرِ ناز
کتنی آہوں کو چھپایا ہے تجھے کیا معلوم
رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے
پانی میں لگی آگ پریشان ہے مچھلی
کچھ شعلہ بدن اُترے ہیں پانی میں نہانے
میں جو خلوت میں بھی ڈرتا تھا سنانے کے لیے
سر بازار وہی گیت سنانا ہی پڑا
نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی
ازل کے مُصوّر کا ہر نقش فانی

امیر عارفی نے جب مخدوم کا انٹرویو لیا تھا تب مخدوم نے کہا تھا:

''کسی ادیب کی تخلیقات میں آفاقیت، ہمہ گیری، انسانی دل کی تہہ در تہہ جان کاری اور زندگی کا جتنا وسیع تجربہ اور مطالعہ ہوگا۔ وہ اتنا اچھا ادب پیش کرسکتا ہے۔'' پھر آگے آزاد نظم کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''آزاد نظم کو زیادہ سے زیادہ مترنم ہونا چاہیے۔ آزاد نظم اپنا مرکزی خیال، اپنے الفاظ، اپنی موسیقی، اپنا پیکر، اپنا پیرہن اور اپنی لٹک لے کر پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اُس کا حلقۂ اثر بڑھتا

جارہا ہے۔''

(مخدوم محی الدین سے انٹرویو۔ پروفیسر امیر عارفی۔ کلیات مخدوم محی الدین۔ فاروق ارگلی ص 69-68)

ن۔م۔ راشد اور میرا جی کے تتبع میں ترقی پسند شعراء نے بھی آزاد نظموں کو رواج دیا۔ جن میں علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی وغیرہ ہیں۔ جس کا اندازہ مخدوم کے مجموعہ گل تر مطبوعہ 1961ء کے کلام سے ہوتا ہے۔ جس کا زیادہ تر حصہ آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔

اگر پاکستان کے پاس فیض جیسا شاعر ہے تو ہندوستان کے پاس مخدوم۔ دونوں ترقی پسند شاعر ہیں۔ دونوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں کے کلام کی آفاقیت، ہمہ گیری، شعری تقاضے، انسانی اقدار، انقلاب کی آرزو، بے باکی، اُٹھان، گونج، درد و کسک اور پیغام کی گہرائی و گیرائی ایک ہی ہے۔ دونوں کے کلام میں انقلابی و رومانی شاعری کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

مخدوم نے نظم ''آج کی رات نہ جا'' لکھی تو فیض نے ''آج کی رات'' اور ''آج کی شب'' لکھی۔ دونوں کی ایک نظم کا نام ''انتظار'' ہے۔ مخدوم کی نظم یوں تو رومانی نظر آتی ہے۔ لیکن انقلاب کا انتظار۔ مخدوم صبر کا دامن چھوڑ کر اپنی محبوبہ سے کہتے ہیں۔

آ بھی جا ' تاکہ مرے سجدوں کا ارماں نکلے
آ بھی جا ' تاکہ تیرے قدموں پر مری جاں نکلے

(مجموعہ۔ سُرخ سویرا)

فیض اپنے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے پر کہتے ہیں۔

غلط تھا دعویٰ صبر و شکیب آجاؤ
قرار خاطر بے تاب تھک گیا ہوں میں
(مجموعہ۔زندان نامہ)

فیضؔ کی نظم ''بہار آئی'' کا پرتو ہمیں مخدومؔ کی نظم ''رُت'' میں دکھائی دے گا۔فیضؔ کی نظم ''تنہائی'' اور مخدومؔ کی نظمیں ''سناٹا'' اور ''وادیٔ فردا'' میں بھی دونوں انتظار میں تھکے ماندے دکھائی دیتے ہیں۔مخدومؔ کی ایک غزل کی ردیف ''آخرشب'' ہے۔فیضؔ نے بھی اسی ردیف میں غزل کہی ہے۔فیضؔ کی نظم ''رقیب سے''۔

آکہ وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا

اورفیضؔ کی دوسری نظم ''کُتے''۔

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے
کہ بخشا گیا جن کو ذوق گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ اِن کا
جہاں بھر کی دھت کار ان کی کمائی

ان دونوں نظموں کا مشترکہ تخیّل مخدومؔ کی مشہور نظم ''اندھیرا'' (سرخ سویرا 1944ء) سے بخوبی ہوتا ہے۔مخدومؔ کا یہ شعر۔

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے

دار سے گزرے ، تری راہ گذر سے پہلے

یہ شعرا پنی لفظیات، اپنے ڈکشن اور خیال کی بنا پر فیضؔ کا دکھائی دیتا ہے۔

مخدومؔ کی نظموں کی طرح اُن کی غزلوں میں بھی فکر و آگہی کے چراغ جلتے ہیں۔ انھوں نے 1956ء سے غزل کہنا شروع کیا۔مخدوم کے پاس غزلوں کا ذخیرہ کم ہے۔لیکن معنوی اور فنی خوبیاں اُن کی غزلوں کی نمایاں صفت ہے۔غزلوں میں غم جاناں اور غم دوراں کا حسین امتزاج ہے۔ان غزلوں کے بے شمار اشعار مشہور و مقبول ہوئے۔کچھ منتخب اشعار یہ ہیں۔

کمان ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دید یار کریں
ہم اپنے ایک دلِ بے خطا کے ساتھ آئیں
تم اپنے محشرِ دارورسن کے ساتھ آؤ
دھڑکا ہے دلِ زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے
گلوئے یزداں میں نوکِ سناں بھی ٹوٹی ہے
کشاکشِ دل پیغمبراں بھی ٹوٹی ہے
پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی
آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

صدیوں سے صدف بند ، گہر بند ، نظر بند
وہ جان صدف ، جان گہر آ تو رہا ہے

مخدومؔ کی ایک غزل کا شعر ہے

نہ کسی آہ کی آواز ، نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہوگیا زنداں میں کہ زنداں چُپ ہے

اور میر دردؔ کا یہ شعر ہے

اُٹھتی نہیں ہے خانۂ زنجیر سے صدا
دیکھو تو کیا سبھی یہ گرفتار سو گئے

خواجہ میر دردؔ اور مخدومؔ کے ان اشعار میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ جب کہ میر دردؔ زمانۂ قدیم کے شاعر ہیں اور مخدومؔ ترقی پسند شاعر۔ اس طرح یہ دونوں شعر عہد جدید کے تقاضوں کی عکاسی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مغنی تبسم اپنے کلیدی مقالے میں لکھتے ہیں:

''مخدومؔ محی الدین ایک روایت شکن انقلابی فن کار تھے۔ انھوں نے عصری اسالیب کو اپنا کر اُن میں نئی اختراعیں کیں۔ اظہار کے نئے پیرایوں سے اردو شاعری کو روشناس کرایا۔''

(مقالہ ''مخدوم محی الدین کی معنویت اور عصر حاضر''
سمینار بضمن 96 سال گرہ 9 / فبروری 2004ء)

مخدومؔ کی شاعری بھرپور شعور کے ساتھ عصرِ حاضر کی عکاس بھی ہے اور آنے والے دور کی نقیب بھی۔ اس طرح مخدومؔ کے بلند تخئیل و افکار نے انھیں زندۂ جاوید بنا دیا۔

آخر کار ہندوستان کا مقبول و معروف محبّ وطن اور حیدرآباد کا ہر دل عزیز شاعر دہلی میں 25 اگست 1969ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ ہزاروں لاکھوں سوگواروں نے وداع کیا۔ تدفین درگاہ حضرت شاہ خاموش حیدرآباد میں ہوئی۔ قبر کے کتبہ پر مخدومؔ ہی کا یہ شعر لکھا گیا۔

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

☆☆☆

ڈاکٹر آمنہ تحسین
لکچرر شعبہ تعلیم نسواں، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مخدوم محی الدین اور فلسفۂ مارکسزم

برق بن کر بتِ ماضی کو گرانے دے مجھے
رسم کہنہ کو تہہ خاک ملانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے
خواب فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے
آگ ہوں آگ ہوں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے

مخدوم محی الدین اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں پاکیزہ محبت اور مسرت کے نغمے سنانے والے رومانی شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ ان دنوں مخدوم کا دل محبت کے نغمے الاپ رہا تھا۔ لیکن بہت جلد وہ روحانی احساسات ایک دہکتی آگ میں تبدیل ہوگئے۔ آگ کا وہ طوفان باہر آنے کو مچل اٹھا۔ اور اپنی تمام تر حدّت کے ساتھ سب کچھ نیست و نابود کرنے کو بے قرار ہوگیا۔

نکتہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ مخدوم کی رومانی شخصیت ایک باغی شخصیت میں کیوں کر تبدیل

ہوگئی؟ ان کے خیالات، جذبات اور لب ولہجہ کیوں بدل گیا؟ بہت جلد ان کے پیار کے نغمے انقلابی گیت کیوں بن گئے؟ اور وہ کیوں کر انقلابی تحریک کے سرگرم کارکن بن گئے۔

یہ بالکل فطری عمل ہے کہ حالات اور ماحول انسانی فطرت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جس کے زیر اثر انسانی شخصیت میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ مخدوم کی زندگی بھی ابتداء ہی سے کئی نشیب وفراز سے گذری۔ جن کا اثر ان کی شخصیت پر مرتسم ہوتا رہا۔ دوسری طرف نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں رونما ہونے والے انقلابات اور ان کے اثرات پر غور وفکر نے بھی مخدوم کی ذہن سازی میں نمایاں حصہ لیا۔ بیسویں صدی کا سورج اپنے ساتھ تمام عالم میں مختلف تبدیلیاں لے کر نمودار ہوا۔ خاص کر بیسویں صدی کی اولین دہائیاں عالمی جنگوں اور انتشار و بحران کی دہائیاں رہیں۔ معاشی بحران میں گھری ساری دنیا ایک نازک ترین دور سے گذر رہی تھی۔ انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو چکا تھا۔ طبقاتی کشمکش، سیاسی ہوس، تشدد، ظلم، زبردستی، بھوک، افلاس، بیروزگاری، سماجی پستی، سیاسی محکومیت بالخصوص مابعد جنگ کے اثرات میں مبتلا ساری انسانیت سسک رہی تھی۔ ایک مخصوص طبقہ کا صدیوں سے جاری ظلم اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اس بربریت نے گویا انسانی تہذیب کو لہولہان کر کے رکھ دیا تھا۔ اس عالمی انتشار کی تصویر خود مخدوم کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمع زندگی
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثارِ بیوگی
عفریت سیم و زر کے کلیجے میں کیوں ہے پھانس
کیوں رک رہی ہے سینے میں تہذیبِ نو کی سانس

انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ
اس آسمان والے کی بیداریاں تو دیکھ
خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی
قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی
(جنگ)

سارے عالم کی اس دگرگوں حالت سے ہندوستان کی حالت بھی کوئی مختلف نہ تھی۔ایک طرف ہندوستانی عوام انگریز حکمرانوں کے جابرانہ تسلط سے متاثر تھے تو دوسری طرف ہندوستانی سرمایہ داروں، زمین داروں اور امیر امراء کے جبر واستحصال نے عام آدمی کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ وہیں پورے ہندوستان میں انگریز حکومت سے آزادی کے حصول کی کوششیں تیز تر ہوگئی تھیں۔اس طرح عام آدمی دُہرے بوجھ تلے دبا، بھوک، افلاس، جبر، استحصال سے متاثر نیم جان ہو چکا تھا۔مخدوم نے ان حالات کی عکاسی بڑے پراثر انداز میں کی ہے۔

جہل ، فاقہ ، بھیک ، بیماری ، نجاست کا مکان
زندگانی ، تازگی ، عقل و فراست کا مسان
وہم زائیدہ خداؤں کا روایت کا غلام
پرورش پاتا رہا ہے جس میں صدیوں کا جذام
ایک ننگی نعش بے گوروکفن ٹھٹھری ہوئی
مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں
اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں
(مشرق)

مخدومؔ جیسا حساس دل شاعر جب اپنے اطراف واکناف کی ہولناکیوں، دلسوز اور تڑپانے والے حالات سے باخبر ہوا اور تمام عالم کی دگرگوں کیفیات سے روشناس ہوا تب ان کے احساس نے کروٹ بدلی۔اقطاع عالم میں انسان جن مصائب وآلام میں گھرا ہوا تھا ان تکالیف کو محسوس کرتے ہوئے مخدوم کہہ اٹھے۔

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جاں سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگرگوں کردیں
قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں
(موت کا گیت)

مخدوم کی مکمل ذہنی تبدیلی اور ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا کا زمانہ تقریباً ایک ہی رہا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہندوستان ایک سیاسی خلفشار اور شورش سے گذر رہا تھا۔اسی سیاسی نشیب وفراز کے دوران 1936ء میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔اس تحریک کا بنیادی مقصد سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرکے اشتراکیت کو بڑھاوا دینا تھا۔ یہ تحریک انیسویں صدی کے اواخر میں جرمن فلسفی کارل مارکس کی دین تھی۔ اس تحریک نے عالمی سطح پر اقتصادیات میں سدھار اور عوام کو اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے بیدار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔اس تحریک کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں سیاسی، ادبی اور عملی اعتبار سے ہندوستان کی فضاء بالکل ہموار تھی۔ چناں چہ بیشتر تخلیق کاروں اور سیاست دانوں اور جہدکاروں نے اس طرف بھرپور توجہ دی۔ان سب میں مخدومؔ محی الدین بھی شامل تھے۔مخدوم مارکسزم کے فلسفہ سے بے انتہا متاثر تھے۔تمام ہندوستانی ترقی پسند مصنفین میں

مخدوم اس لیے بھی منفرد ہیں کہ انھوں نے اشتراکی نظریات کو اپنی تخلیقات کا حصہ بھی بنایا اور زندگی بھر عملی طور پر ان ہی نظریات پر کاربند رہے۔

دراصل مخدومؔ کے لاشعور میں بچپن سے ہی اپنے چچا بشیر الدین کی زبانی سنی گئی روس کے انقلاب کی تفصیلات اور اس انقلاب کے پیچھے کارفرما کارل مارکس کے نظریات اور لینن کی سرپرستی میں محنت کشوں کی فتح کی کہانی محفوظ تھی۔ اور خود اپنے چچا کو خلافت تحریک میں سرگرم کردار ادا کرتے ہوئے بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ وہیں گاندھی جی، محمد علی، شوکت علی کی جدوجہد سے بھی متاثر تھے۔ یوں مخدومؔ کے ذہن میں انقلاب، آزادی اور جہدِ مسلسل کی دبی چنگاریاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ بس اسے ایک جِلا کی ضرورت تھی۔ ایسے میں دوسری جنگ عظیم کی ہولناکیاں، ہندوستانی عوام کی حالتِ زار اور ملک کو ظالم پنجوں سے آزاد کرانے کے جذبے، ان کی ذہنی تبدیلی کا باعث بنے۔ اس ذہنی تبدیلی میں مارکسزم کے نظریات کا بڑا دخل رہا۔ جیسا کہ مخدوم کہتے ہیں۔

''اس زمانے میں سودیشی اور خلافت تحریک کا اثر ہندوستان کے گھر گھر پر تھا۔ میرے چچا اس تحریک کے موئیدین میں تھے۔ ہمارے گھر میں گاندھی جی، شوکت علی، محمد علی اور ان کی والدہ کے چرچے اکثر رہا کرتے تھے۔..... میں شروع ہی سے نہرو اور سبھاش چندر بوس سے بہت متاثر تھا۔ 1934ء میں مارکسزم کے مطالعہ سے دماغ میں کشادگی پیدا ہوئی اور 1936ء سے' میں کمیونسٹ پارٹی کا کارکن بن گیا۔.....قومی تعصب اور بادشاہت کے خلاف میرا تصور اسی زمانے میں سنورا اور نکھرا۔ اس تصور کے اظہار کا ذریعہ مجھے شعر میں ملا۔ کیوں کہ شعر پر کوئی پابندی نہیں تھی۔''

(رسالہ ''صبا'' حیدرآباد۔ (مخدوم نمبر) اکٹوبر۔ڈسمبر 1966ء۔ص 281-280)

جیسا کہ مخدوم نے کہا کہ مارکسزم کے نظریات نے ان کے ذہن کو کشادگی عطا کی اور ان کے تصورات کو ایک شکل دے کر عمل پیرا ہونے میں اشتراکیت کے فلسفے نے راہیں ہموار کیں۔ آیئے دیکھیں کہ مارکس کے وہ کونسے نظریات تھے جو مخدوم کو متاثر کر گئے۔

کارل مارکس نے فریڈرک اینگلز کے ساتھ مل کر 1848ء میں پیرس سے کمیونسٹ مینی فیسٹو شائع کیا۔ اس مینی فیسٹو میں مارکس نے اپنے اشتراکی خیالات کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ مارکس کے مطابق دنیا سے سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنا ناگزیر ہے اور اس کا خاتمہ تب ہی ممکن ہے جب محنت کش طبقہ میں بیداری پیدا ہو۔ اس فرسودہ نظام کو ختم کر کے اشتراکیت کے نظریہ کو فروغ دے کر ہی دنیا سے استحصال اور ناانصافیوں کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس نظامِ سرمایہ داری نے کمزور اور محنت کش عوام کا معاشی استحصال کر کے ان کو زبوں حالی تک پہنچا دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں سماج میں طبقاتی کشمکش، انتشار اور بے چینیاں اپنے عروج پر پہنچ گئی ہیں۔ کارل مارکس کے یہ خیالات مخدوم کو گویا اپنے ملک کے حالات سے بالکل یکساں لگے۔ مخدوم نے اپنے ملک کے سماج کی تصویر اس طرح کھینچی۔

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج
لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
ایک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام ودر
جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر
مارو کژدم کا ٹھکانا جس کی دیواروں کے چاک
اُف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہولناک
جن میں رہتے ہیں مہاجن، جن میں بستے ہیں امیر

جن میں کاشی کے برہمن ، جن میں کعبے کے فقیر
رہزنوں کا قصرِ شوریٰ ، قاتلوں کی خواب گاہ
کھل کھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ
جس جگہ کٹتا ہے سر انصاف کا ، ایمان کا
روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا
سیم و زر کا دیوتا جس جا کبھی سوتا نہیں
زندگی کا بھول کر جس جا گزر ہوتا نہیں
(حویلی)

مارکس کا خیال تھا کہ بہتر سماج کی تشکیل کے لیے معاشی مساوات ناگزیر ہے۔اس کے مطابق ہر زمانے میں پیداوار کے کچھ خاص طریقے ہوتے ہیں جو بدلتے رہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ پیداوار کے طریقوں اور سماجی تعلقات میں ہم آہنگی باقی نہیں رہتی۔جس کی بنا پر بے شمار اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور یہی اختلافات کی زیادتی انقلاب کو دعوت دیتی ہے۔ مارکس کا خیال تھا کہ اس انقلاب کی وجہ سے ذرائع پیداوار اور سماجی تعلقات میں منظّم ربط پیدا ہوگا، معاشی مساوات قائم ہوگی اور یہ مساوات صرف کمیونزم ہی پیدا کرسکتی ہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے مارکس ایک ایسے انقلاب پر زور دیتا ہے جو پورے مروجہ نظام کو تبدیل کر دے۔ مخدومؔ بھی اپنے ملک کے حالات کے پس منظر میں ایسے ہی انقلاب کے منتظر نظر آتے ہیں۔

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ راہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

نہ تابناکی رُخ ہے نہ کاکُلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گذر بھی جا کہ تر انتظار کب سے ہے
(انقلاب)

کارل مارکس نے سماج کو دو طبقوں میں تقسیم کیا۔ایک بورژوا طبقہ جس میں سرمایہ دار ،صنعت کار اور متوسط درجہ کے لوگ شامل تھے۔ اور دوسرا پرولتاریہ طبقہ جس میں مزدور، کسان اور محنت کش افراد کو رکھا گیا۔ مارکس کا بنیادی مقصد اس پرولتاریہ طبقہ میں طبقاتی شعور بیدار کر کے انھیں اپنے حقوق کے لیے جگانا تھا۔ چناں چہ اس نے پرولتاریہ طبقہ کے آگے لائحہ عمل رکھا جس پر چل کر اشتراکی سماج تشکیل دیا جاسکتا ہے۔ایک ایسا نیا سماج جو طبقہ وارانہ منافرت سے پاک ہو۔جس میں فرد کو سچی آزادی اور اخوت حاصل ہو۔ایسے ہی نظام کی تمنا مخدومؔ کے دل میں بھی بیدار ہوئی۔

ایسا جہان جس کا اچھوتا نظام ہو
ایسا نظام جس کا اُخوت پیام ہو
ایسا جہان جس کی نئی صبح و شام ہو
(جہانِ نو)

مخدومؔ نہ صرف نئی دنیا نئے نظام کی تمنا کرتے ہیں بلکہ اس نئے نظام کی تشکیل میں عمل پیرا ہونے کا عزم بھی کرتے ہیں۔

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
ایک نئی دنیا ، نیا آدم بنایا جائے گا

مارکس کے مطابق پیداوار کے نئے طریقوں کے نتیجہ میں سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کا طبقہ وجود میں آیا۔ دوسری طرف ان کارخانوں اور ملوں کے لیے مزدور طبقہ کا ظہور ہوا جو مکمل طور پر ان سرمایہ داروں کے ہاتھوں مجبور و بے بس تھا۔ یہ سرمایہ دار مزدوروں کی محنت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ اس طرح سے سرمایہ داروں نے جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ تمام سماجی زندگی پر قبضہ کرلیا۔ مارکس کا خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کو جتنی ترقی ہوگی اتنی ہی زیادہ مزدوروں یا پرولتاریہ کی تعداد بڑھے گی۔ ان کے افلاس میں اضافہ ہوگا۔ اگر یہ محنت کش اپنے حقوق کے لیے ان سرمایہ داروں کے آگے صف آراء ہوجائیں تو صدیوں سے مروج یہ نظام زوال پذیر ہوجائے گا۔ اور محنت کشوں کی فتح ہوگی۔ یہ طبقہ وارانہ منافرت ایک بڑے انقلاب کے ذریعہ ہی ختم کی جاسکتی ہے۔ چوں کہ پرولتاریہ کا استحصال سرمایہ داروں کی قوت، جبر اور تشدد پر مبنی ہے۔ اسی لیے اُس جبر کو قوت وتشدد کے ذریعہ ہی نیست و نابود کیا جاسکتا ہے۔ بغاوت اس منزل تک پہنچنے کا واحد راستہ ہے۔ مخدومؔ بھی اسی بغاوت کے راستے کو اپنا کر فرسودہ نظام کو تباہ وتاراج کردینا چاہتے ہیں۔

سرِ پُر نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا
شورِ نالہ سے درِ ارض و سماں توڑوں گا
ظلم پرور ، روشِ اہل جہاں توڑوں گا
عشرت آباد امارت کا مکاں توڑوں گا
توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو پنجہ عسرت سے چھڑانے دے مجھے
(باغی)

بلکہ مخدومؔ اُس جبر واستحصال کے نظام کے مکمل خاتمہ کے لیے زلزلے، بجلیاں اور

آندھیوں کو تک اپنے ساتھ شامل کرلیتے ہیں۔

زلزلو آؤ دہکتے ہوئے لاؤ آؤ
بجلیو آؤ گرج دار گھٹاؤ آؤ
آندھیو آؤ جہنم کی ہواؤ آؤ
آؤ یہ کرہء ناپاک بھسم کر ڈالیں
کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کرڈالیں
(موت کا گیت)

مخدومؔ کے یہ انقلابی گیت ملک کی آزادی کی لڑائی کے پس منظر میں ابھر رہے تھے۔ بلکہ محنت کش ومزدوروں اور عام آدمی میں ملک کی آزادی کا جوش، جذبہ اور انقلاب پیدا کرنے کے محرک بن رہے تھے۔ مخدومؔ کی نظر میں ملک کو صرف غیر ملکیوں کے اقتدار سے پاک کرنا اور اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں ملک کی باگ ڈور تھمادینا ہی اصل آزادی نہیں تھی۔ بلکہ ایک ایسا ''سوراج'' جس میں سرمایہ داری کا نظام نہ ہو وہ محنت کشوں کی حکومت کے قیام کے طلب گار تھے۔ جیسا کہ مارکس نے بھی صرف انقلاب کو ہی کافی قرار نہیں دیا تھا بلکہ پرولتاریہ طبقہ کو حکمرانی کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اس ضمن میں مخدوم کا خیال تھا۔

وہ جنگ ہی کیا ، وہ امن ہی کیا — دشمن جس میں تاراج نہ ہو
وہ دنیا دنیا کیا ہوگی — جس دنیا میں سوراج نہ ہو
وہ آزادی آزادی کیا — مزدوروں کا جس میں راج نہ ہو
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
(جنگِ آزادی)

مخدومؔ نے کارل مارکس کی طرح ایک اور فلسفی لینن کے اشتراکی نظریات سے بھی اثر آفرینی قبول کی۔ لینن روس کی انقلابی تحریک میں مزدوروں اور محنت کشوں کی رہنمائی کرتا رہا اور 1917ء میں حکومت کا تختہ الٹنے میں اسے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ لینن کا خاص کارنامہ یہ رہا کہ اس نے مارکسزم میں کافی اضافہ کیا۔ جیسا کہ کارل مارکس کا خیال تھا کہ مزدور پیشہ طبقوں میں طبقاتی شعور اس وجہ سے پیدا ہوگا کہ انھیں اپنی روزمرہ کی بنیادی ضرورتوں کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اسی جدوجہد کی وجہ سے ان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام انھیں کس درجہ پست حیثیت پر رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا ان ہی مزدوروں میں سے قیادت کی شروعات ہوگی۔ لیکن لینن کارل مارکس کے اس خیال کے برخلاف یہ مانتا ہے کہ مزدوروں کو اپنی انجمنیں بنانی چاہیے۔ جن کا مقصد مزدوروں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا ہو۔ ان انجمنوں کے علاوہ لینن نے انقلابیوں کے چھوٹے گروہ بنانے اور انقلابی سرگرمیاں جاری رکھنے پر بھی زور دیا۔

مخدومؔ 1940ء سے کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہوئے۔ اس وقت تک مخدوم خود کو انقلابی سرگرمیوں کے لیے وقف کر چکے تھے۔ انھیں مزدوروں اور محنت کش عوام کے مصائب وآلام سے نہایت ہمدردی پیدا ہو چکی تھی۔ ان کی انقلابی جدوجہد کا اصل محرک وہی مزدور طبقہ تھا۔ لینن کی طرح مخدوم بھی مزدوروں کی یونین بنانے اور انھیں متحد کرنے میں بہت دل چسپی رکھتے تھے تاکہ اجتماعی جدوجہد سے ان کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ چناں چہ مخدومؔ نے بڑی کوششوں سے ریاست کی کئی صنعتوں میں ٹریڈ یونینس قائم کیں۔ جن میں مختلف طرح کی صنعتوں اور کارخانوں کے ہزاروں مزدور شامل تھے۔ بالخصوص انھوں نے ریلوے ملازمین کی یونین کا انعقاد عمل میں لایا تھا۔ ان ٹریڈ یونینس کے مخدومؔ فعال اور بااثر صدر رہے تھے۔ ان کی رہنمائی میں کئی صنعتوں میں مزدوروں کے حقوق کے لیے پرزور مطالبات اور ہڑتالیں

منعقد کی گئیں۔ جس کے نتیجہ میں مزدوروں کے اقتصادی مطالبات منوانے میں کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ اس تمام عرصہ میں مخدوم کو کئی دفعہ روپوش بھی ہونا پڑا۔ اور انھیں کئی دفعہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی۔ لیکن وہ اپنی پارٹی اور اس کے نظریات پر مسلسل عمل پیرا رہے۔ اور بورژوا طبقہ کے خلاف ہر محاذ پر جنگ کے لیے ہمیشہ آمادہ رہے۔ ملک کی آزادی سے قبل حکومت برطانیہ اور سماجی نظام سے ٹکر لیتے رہے۔ ملک کی آزادی کے بعد نظامِ حکومت کانگریس پارٹی کے ہاتھوں چلی گئی۔ اس وقت مخدوم ایوان میں اپوزیشن لیڈر کی حیثیت رکھتے تھے۔ 1956ء میں پارٹی نے انھیں قانون ساز کونسل کے لیے اپنا امیدوار بنایا تھا۔ اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے کانگریس کی عوام دشمن پالیسیوں کے خلاف تادمِ مرگ نبرد آزما رہے۔ یہی ان کی انسانی ہمدردی، انقلابی جدوجہد اور استحصال و ناانصافیوں کے خلاف سرگرم ہو جانے کا جذبہ ایک دہکتی آگ بن کر ان کے لہو میں دوڑتا رہا اور وہ کہتے رہے۔

سُرخ پرچم اور اونچا ہو، بغاوت زندہ باد

مطالعہ و استفادہ:

1۔ ''مخدوم محی الدین حیات اور کارنامے'' — ڈاکٹر شاذ تمکنت
2۔ ''مخدوم محی الدین کی شاعری کا تنقیدی جائزہ'' — ڈاکٹر منصور عمر
3۔ ''مخدوم محی الدین'' — الیکسی سونا چیف (مصنف) محمد اسامہ فاروقی (مترجم)
4۔ ''بساطِ رقص'' — مخدوم محی الدین
5۔ ''یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین'' — ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
6۔ رسالہ ''صبا''۔ حیدرآباد 1966ء

☆☆☆

ڈاکٹر فیروز عالم
لکچرر شعبۂ اُردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کمان ابروئے خوباں کا بانکپن اور مخدوم محی الدین

مخدوم محی الدین بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ غزل گوئی کی طرف انھوں نے بہت بعد میں توجہ دی۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''سرخ سویرا'' میں ایک بھی غزل نہیں ہے۔ دوسرے مجموعے ''گل تر'' میں 19 اور بساطِ رقص میں دو غزلیں شامل ہیں۔ اس طرح ان کی غزلوں کا کل سرمایہ 21 غزلوں پر مشتمل ہے۔ انھوں نے پہلی غزل 1956ء میں ایک طرحی مشاعرے کے لیے میر کے انداز میں کہی۔ اس غزل کا مطلع تھا:

سیماب وشی ، تشنہ لبی ، باخبری ہے
اس دشت میں گو رختِ سفر ہے تو یہی ہے

مخدوم نے اپنی غزل گوئی کے بارے میں ''گل تر'' کے دیباچے میں لکھا ہے:

''غزل کہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں، سوا اس کے داخلی محرکات جمع ہوتے ہوتے ایک دن غزل کی صورت میں بہہ نکلے۔''

مخدوم نے بھلے ہی اپنی شاعری کے آخری دور میں غزلیں کہیں لیکن اس صنف سے انھیں شروع سے ہی مناسبت تھی۔ اس کا ثبوت 1944ء میں شائع ہونے والے ان کے پہلے شعری مجموعے ''سرخ سویرا'' کی وہ نظمیں ہیں جو مسلسل غزل کی ہیئت میں ہیں۔ اس ضمن میں

''نیند''، ''ساگر کے کنارے''، ''آسمانی لوریاں''، ''لمحہ رخصت'' اور ''پشیمانی'' وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ کس پیکر کی رنگینی سمٹ کر دل میں آتی ہے
مری بے کیف تنہائی کو یوں رنگیں بناتی ہے
[نظم ''نیند'']

کچھ سننے کی خواہش کانوں کو کچھ کہنے کا ارماں آنکھوں میں
گردن میں حمائل ہونے کی بے تاب تمنا باہوں میں
[نظم ''لمحۂ رخصت'']

اگر چہ مخدوم محی الدین بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے غزل کے فارم کو بڑے سلیقے اور احتیاط سے برتا ہے۔ ان کی غزلوں میں اردو کی روایتی غزل کا لب ولہجہ اور آہنگ ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں داخلیت بھی بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی غزلیں سرتا سر روایتی انداز کی حامل ہیں۔ مخدوم کی نظموں میں اسلوب کا جو اچھوتا پن، زبان ولفظیات کی جو تازگی اور ندرت ملتی ہے وہ ان کی غزلوں میں بھی موجود ہے۔ ان کی غزلوں کا ڈکشن اگر چہ روایتی غزل سے ہی ماخوذ ہے لیکن خیال اور انداز بیان کی تازگی اسے انفرادیت عطا کرتی ہے۔ انھوں نے سیاسی افکار ومسائل کو پرانی علامتوں کے سہارے بڑے سلیقے سے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مخدوم نے دانستہ طور پر سیاسی اور انقلابی افکار ومسائل کو غزلوں میں پیش نہیں کیا بلکہ یہ مسائل اور افکار ان کی شخصیت کا حصہ بن کر سامنے آئے ہیں۔ سماجی اور سیاسی مسائل کی عکاسی انھوں نے غزل کے مخصوص اشاروں کنایوں اور علامتوں کے ذریعے کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہائے کس دھوم سے نکلا ہے شہیدوں کا جلوس
جرم چپ سر بہ گریباں ہے جفا آخرِ شب
دیپ جلتے ہیں دلوں میں کہ چتا جلتی ہے
اب کی دیوالی میں دیکھیں گے کہ کیا ہوتا ہے

مخدوم اپنی نظموں میں بعض اوقات بے حد سخت الفاظ اور لب ولہجہ استعمال کرتے ہیں۔ظلم و استحصال اور ناانصافی کے خلاف ان کا قلم تیز دھار تلوار کی طرح چلتا ہے۔نظم ''باغی'' کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلا دے وہ شرارا ہوں میں

یا یہ شعر۔

توڑ ڈالوں میں زنجیر اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

لیکن وہی مخدوم جب غزل کہتے ہیں تو نہ صرف لب ولہجہ نرم وشیریں ہو جاتا ہے بلکہ الفاظ کا انتخاب بھی ان کے بدلے ہوئے رویے کا پتہ دیتا ہے۔

مخدوم کی غزلوں میں ان کے ماحول و معاشرے کے حالات و مسائل کی بڑی پرخلوص عکاسی ملتی ہے۔ظلم واستحصال کے خلاف لوگوں کی بے حسی، زندگی میں حرکت وعمل کی کمی اور ایثار وقربانی کے جذبے کے فقدان پر ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں

موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے
نہ کسی آہ کی آواز نہ زنجیر کا شور
آج کیا ہوگیا زنداں میں کہ زنداں چپ ہے

شاعر اس بات سے پریشان ہے کہ لوگوں میں اتنی بے حسی چھا چکی ہے کہ وہ صدائے احتجاج بلند کرنا تو کجا آہ کی آواز بھی نہیں نکالتے۔لوگ اتنے شکست خوردہ، مایوس اور کمزور ہو گئے ہیں کہ ان کی آہنی بیڑیوں سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے ذرا سی بھی کوشش نہیں کرتے۔قید خانے سے نہ آہ کی آواز آرہی ہے اور نہ زنجیر کا شور سنائی دے رہا ہے۔یہ اس بات کی علامت ہے کہ قیدیوں نے ہار مان لی ہے اور حالات کے آگے سپر ڈال دیا ہے۔

مخدوم نے سیاسی اور سماجی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ غزل کے بنیادی موضوع حسن وعشق کو موضوع بنایا ہے۔وہ عام عشقیہ تجربات کی عکاسی بھی بڑے انوکھے انداز میں کرتے ہیں۔

اسلوب کی تازگی نے ان اشعار کو مزید تاثر عطا کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر
جب برستی ہے تری یاد کی رنگین پھوار
پھول کھلتے ہیں درِ میکدہ وا ہوتا ہے
بدلا بدلا سا نظر آتا ہے ، دنیا کا چلن
آپ کے ملنے سے ، ہم جیسے پریشانوں سے
جہاں بھی بیٹھے ہیں ، جس جا بھی رات مے پی ہے

انھیں کی آنکھوں کے قصے ، انھیں کے پیار کی بات
تمام عمر چلی ہے تمام عمر چلے
الٰہی ختم نہ ہو یار غم گسار کی بات

فن شاعری اس بات کی متقاضی ہے کہ براہ راست کی بجائے اشارے کنائے میں اور ڈھکے چھپے انداز میں بات کہی جائے۔ مخدوم کی غزلوں میں یہ خوبی بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس کی وجہ سے اشعار کی اثر انگیزی اور لطافت دو چند ہوگئی ہے۔ چند اشعار دیکھیے :

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے
بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے
بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے
کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیر درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخر شب

مخدوم اپنے تجربے اور تاثر کی پیش کش اس طرح کرتے ہیں جیسے یہ ان کا اپنا نہیں ہر انسان کا تجربہ اور تاثر ہے۔ ان کی یہ فکری گہرائی ان کے ذہنی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے اشعار میں سوز و گداز پیدا ہوا ہے۔ مخدوم کو اہلِ ہوس سے شکایت ہے ، اپنے ماحول اور معاشرے کے افراد کی بے حسی اور سرد مہری انھیں بے چین کرتی ہے۔ اس مایوس کن اور اذیت ناک صورتِ حال میں وہ سچے جذبۂ عشق کو سہارا تصور کرتے ہیں :

اس گزر گاہ میں اس دشت میں اے جذبۂ عشق

جز ترے کون یہاں آبلہ پا ہوتا ہے

مخدوم کی غزلوں میں جو حسین رومانی فضا ملتی ہے ، جام و مینا میں تلخیوں کو گھول دینے کی باتیں ملتی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک تھکا ماندہ سیاست داں اور انقلابی تھوڑی دیر کے لیے حسن و عشق کی دل کش فضا میں سانس لینے کے لیے آ گیا ہے۔ مخدوم کا یہ لب و لہجہ بدلے ہوئے حالات ، زندگی کے ہنگاموں ، حادثات اور تلخیوں کا عطا کردہ ہے داؤد اشرف نے مخدوم کی شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

''وہ ہمارے شاعروں میں سیاسی زندگی سے سب سے زیادہ گتھے ہوئے ہونے کے باوجود اپنے محراب دل میں شاعری کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔ مخدوم اپنی شاعری کی مختلف خوبیوں ، مزاج کے ٹھہراؤ اور اعتدال اور فکر و فن میں جذباتیت اور عقلیت کے امتزاج اور سب سے بڑھ کر اپنے اشعار کی غنائیت کے باوجود شاعری میں کسی نئے اسلوب کے بانی نہیں ہیں۔ ان کی لے بہ حیثیت مجموعی انفرادیت ضروری رکھتی ہے۔''

[مخدوم ایک مطالعہ ، ص۔ 150]

مخدوم بھلے ہی کسی نئے اسلوب کے موجد نہ ہوں لیکن یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے غزل کی روایات کا احترام کرتے ہوئے جو کچھ لکھا اس میں جذبے کی گرمی اور فکر کی گہرائی سمو دی اور اس کا اثر دوبالا کر دیا۔

مخدوم نے نامانوس تراکیب ، تشبیہات و استعارات اور علامات سے اپنی غزلوں کی زبان اور شعری حسن کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ وہ صناعی اور آرائش کے ذریعے اشعار کو بوجھل نہیں بناتے بلکہ بے حد احتیاط سے اس کارگہہ شیشہ گری میں قدم بڑھاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی شعری روایات کا احترام ملتا ہے۔ ان غزلوں میں شاعر کے احساسات ،

اچھائی اور برائی کے بارے میں اس کے خیالات اس کی اذیتوں اور تذبذب کا واضح اظہار ملتا ہے۔ ابہام اور ادھوری بات سے گریز اور لفظی بازی گری سے اجتناب کرتے ہوئے اپنے خیالات کی پراثر ترسیل مخدوم کی غزل گوئی کی خصوصیت ہے۔

مخدوم کی غزلوں میں ماضی اور اس کی یاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ماضی کی یاد انھیں حال میں جینے کا حوصلہ اور مستقبل کے خواب دیکھنے کا ولولہ عطا کرتی ہے۔ ماضی کی یاد انھیں ناسٹلجیا کا شکار نہیں بناتی بلکہ وہ ان کا قیمتی اثاثہ ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

یاد کے چاند دل میں اترتے رہے
چاندنی جگمگاتی رہی رات بھر
بانسری کی سریلی سہانی صدا
یاد بن بن کے آتی رہی رات بھر
ہر دم ترے انفسا کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے
ایک جھونکا ترے پہلو کا مہکتی ہوئی یاد
ایک لمحہ تری دلداری کا کیا کیا نہ بنا
ماضی کی یادگار سہی یاد دل تو ہے
طرزِ نشاط نوحہ گراں دیکھتے چلیں

مخدوم کی غزلوں میں مثبت طرز فکر اور رجائی رجحان کے ساتھ ساتھ ایک نشاطیہ لہجہ ملتا ہے۔ ان کے اشعار اپنے لب و لہجے کی شائستگی، واضح احتیاط اور تہذیب عشق کے باوصف نمایاں تاثر رکھتے ہیں:

اس شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو

کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رہی ہے
دھڑکا ہے دل زار ترے ذکر سے پہلے
جب بھی کسی محفل میں تری بات چلی ہے
چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں
خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

آہوئے خوش چشم سے کم کم ہی سہی نسبتِ پیمانہ رکھنا، معشوق کے ذکر سے پہلے دل کا دھڑکنا اور محبوب کا اتنا احترام کہ خواب میں بھی اس کا نام ہونٹوں پر آہستہ سے آتا ہے۔ یہ ہے مخدوم کا غزلیہ انداز جس کا خمیر مشرق کی تہذیبی اقدار سے اٹھا ہے۔

مخدوم کی اکثر غزلوں میں رات کا ذکر ملتا ہے۔ یہ رات یادوں کا سرچشمہ ہے۔ یادیں جو کبھی ہجر، کبھی وصل اور کبھی ایک درد رائیگاں کی شکل میں شعر کا قالب اختیار کر لیتی ہیں۔ مخدوم کی ان غزلوں میں رات کے مختلف ابعاد (Dimensions) ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے مطلع یہ ہیں:

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
چشم نم مسکراتی رہی رات بھر
پھر چھڑی رات بات پھولوں کی
رات ہے یا برات پھولوں کی
عشق کے شعلے کو بھڑکاؤ کہ کچھ رات کٹے
دل کے انگارے کو دہکاؤ کہ کچھ رات کٹے

بڑھ گیا بادۂ گلگوں کا مزہ آخرِ شب

اور بھی سرخ ہے رخسارِ حیا آخرِ شب

ان غزلوں کے علاوہ دیگر غزلوں کے بھی بہت سے اشعار میں رات کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً یہ شعر:

آج تو تلخیِ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

اکثر اردو شعرا نے اپنی غزلوں میں شراب اور میکدے کو موضوع بنایا ہے۔ کسی نے اس سے حقیقی معنی مراد لیے ہیں اور کسی نے مجازی۔ شراب پر ایسے شعرا نے بھی اشعار کہے ہیں جنھوں نے پوری زندگی شراب نوشی کی اور ایسے شعرا نے بھی جنھوں نے اس کا ایک گھونٹ بھی کبھی نہیں پیا۔ مخدوم کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے، انھوں نے مے اور میکدہ سے کیا کام لیا ہے:

ہر شام سجائے ہیں تمنّا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخیِ ایّام بھی پی ہے

کون جانے کہ ہو کیا رنگِ سحر رنگِ چمن
میکدہ رقص میں ہے پچھلے پہر سے پہلے

جب برستی ہے تری یاد کی رنگین پھوار
پھول کھلتے ہیں درِ میکدہ وا ہوتا ہے

کھٹکھٹا جاتا ہے زنجیر درِ میخانہ
کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخرِ شب

پہلے شعر میں حالات کی ناسازگاری کو مئے تلخیِ ایّام کہا گیا ہے۔ دوسرے میں میکدہ سے پورا ماحول و معاشرہ مراد لیا گیا ہے، تیسرے شعر میں میکدہ اپنے حقیقی معنوں میں سامنے آیا ہے اور چوتھے شعر میں میخانے کو انسانی ضمیر سے تعبیر کر سکتے ہیں جسے کوئی آبلہ پا جھنجھوڑ کر

بے دار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مخدوم کی غزلوں میں پیکر تراشی کے بھی اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ یہ اشعار پڑھ کر قاری خیال اور جذبے کی ایک مخصوص فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے:

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کر سحر سے پہلے

یہ شعر صوری اور معنوی اعتبار سے بے حد معنی خیز ہے اور ذہن میں اس پوری صورتِ حال کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔ اس شعر کا مغنی محفل سے دور اکیلے گاتا رہا اور سحر سے پہلے ساز پر سر رکھ کر سو گیا۔ اس شعر میں ایک طرف جہاں فن کی ناقدری کا احساس ہوتا ہے وہیں دوسری طرف ایک ایسے انسان کی تصویر بھی سامنے آتی ہے جو اپنے ماحول اور معاشرے کی بھلائی کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے اور کوئی اس کی آواز پر لبیک نہ کہے حتیٰ کہ وہ اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دے

ایک اور شعر دیکھیے جس کو مصوری اور موسیقیت نے فضا آفریں بنا دیا ہے:

بجا رہا تھا کہیں دور کوئی شہنائی
اٹھا ہوں آنکھوں میں اک خوابِ ناتمام لیے

اس شعر میں لفظ ''دور'' کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ رات ہے، سناٹا ہے اور ایسے میں دور کہیں کوئی شہنائی بجا رہا ہے۔ یہ منظر شاعر کو ماضی کی یاد سے ہم کنار کرا رہا ہے۔

مخدوم نے اپنی غزلوں میں بہترین تراکیب تراشی ہیں۔ خیال کی خوشبو، بدن کی مہک، درد کی شمع، غم کی لو، یاد کے چاند، زخموں کے چراغ، گلوں کی سانس، رگِ گلستاں، جسم کا سورج اور زنجیرِ جاں وغیرہ تراکیب انھوں نے اپنی غزلوں میں استعمال کی ہیں۔

مخدوم کی غزلیں غنائیت سے پر ہیں۔ نغمگی ان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اردو کی

کلاسیکی شاعری، روایتی تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں سے مخدوم نے خوب کام لیا ہے۔ ان کی غزلیں انفرادیت اور جدت طبع کا پتہ دیتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں نغمگی اور تازگیِ اظہار، نزاکتِ احساس اور شائستگیِ فکر کا مکمل امتزاج ملتا ہے۔ ان کی غزلوں میں کہیں کہیں زبان و بیان کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ملتی ہیں لیکن ان کے کلام کی خوبیوں کے مدنظر یہ نہایت کم ہیں۔

اگرچہ مخدوم محی الدین کی غزلوں کا سرمایہ قلیل ہے لیکن اس سے ان کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ آورد کے نہیں آمد کے قائل تھے اور اسی لیے ان کی غزلوں میں بھرتی کے اشعار نہیں کے برابر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان غزلوں میں جو تغزل، نغمگی، شیرینی اور دل آویزی ہے وہ قاری کا من موہ لیتی ہے۔ مخدوم نے بڑی خوبی سے غم حیات کو غم کائنات بنا کر اپنے اشعار میں پیش کر دیا ہے۔ پروفیسر سیّدہ جعفر لکھتی ہیں:

''مخدوم نے اپنی غزلوں میں تلخیِ دوراں کو غم جاناں میں گھول کر اسے اس طرح داخلی زندگی کا خوب صورت تجربہ بنا دیا ہے کہ غزل کے سانچے میں غمِ ایّام اور محبت کی واردات کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔''

[مخدوم محی الدین، ص۔ 70، ناشر: ساہتیہ اکادمی]

مخدوم غزل کو کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن تصور کرتے تھے اور غزل گانے کو دیدِ یار سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی تمام غزلیں اردو کی غزلیہ روایت کی آئینہ دار ہیں۔ اگر وہ اس طرف مزید توجہ دیتے تو شاید انھیں نظم گو کے طور پر جانا جاتا۔

☆☆☆

عائشہ صدیقہ شاداں
ڈاکومنٹیشن آفیسر، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد

''تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چُپ ہے''
- مخدومؔ

اب جب کہ سارے ہندوستان بھر میں جناب مخدوم محی الدین کی صدی تقاریب مخدوم سوسائٹی، انجمن ترقی پسند مصنفین اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام بڑے شاندار پیمانے پر دھوم دھام سے منائی جارہی ہیں۔ اس خوشگوار موقع پر مجھے میرے دادا جناب مخدوم محی الدین کے بارے میں یادوں کو تازہ کرنے کا سنہری موقع ملا۔ جناب مخدوم محی الدین کے انتقال کے وقت میری عمر ایک سال رہی ہوگی۔ میری ماں (نصیرہ سلطانہ) نے مجھے بتایا کہ آپ کے دادا دیسائی کے دواخانے (حمایت نگر) میں مجھے دیکھنے کے لیے تشریف لائے تھے دیکھنے کے بعد کہنے لگے کہ یہ بچی بالکل ''ویلین ٹینا ترشکوا'' جیسی لگتی ہے۔ روسی خلاء بازوں کا ایک وفد یوری گگارن کے ہم راہ حیدرآباد آیا ہوا تھا، اس میں ویلین ٹینا ترشکوا خلاء باز بھی شامل تھی۔ ظاہر ہے کہ میری آنکھوں نے انہیں دیکھا ضرور ہے لیکن میرا شعور اتنا پختہ نہیں ہوا تھا کے یاد رکھ سکوں۔ میں نے اپنے والدین اور افراد خاندان سے ان کے بارے میں بہت سی باتیں سنی تھیں جو کہانیاں جیسی لگتی تھیں۔ میں نے اپنی دادی ماں (رابعہ بیگم) کی زبانی، خود ان کی اپنی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے سنا تھا کہ تمہارے چچا باوا (دادا) نے کڑی محنت کی اور بڑی مشکلات کا سامنا کیا۔ ''میں در پردہ ان کے کاموں میں خاموشی کے ساتھ ان کا ساتھ دیتی رہی۔ چچا باوا کے بڑے

بھائی جناب نظام الدین نے ان مشکل حالات میں ہمارا ہر طرح سے ساتھ دیا۔ میرے بچے ان کی نگرانی میں پرورش پاتے رہے۔ میری بڑی بیٹی (ذکیہ اساوری) نے تمہارے چچا باوا کو دیکھا تھا لیکن نصرت ان کو جانتا نہیں تھا'' یہ سب باتیں سننے کے بعد میرے دل پر گہرا اثر ہوا کہ میرے دادا کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اس قدر پکے ارادے کے آدمی تھے کہ اپنے مقصد کو کامیاب بنانے کے لیے بیوی بچوں سے برسوں دور رہے۔ میں بچپن ہی سے مخدوم سوسائٹی جو ہر سال پابندی سے ان کی سالگرہ تقاریب کا اہتمام کرتی آرہی ہے جس کی روح رواں ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور ان کے ساتھ کامریڈ محمد یوسف، کامریڈ جی رام چندر اور کامریڈ نصرت محی الدین اپنا تعاون کرتے رہے۔ ان خوشگوار محفلوں میں فائن آرٹس اکیڈیمی اور سنگیت سادھنا کے فن کار استاد وٹھل راؤ، جسپیر کور، نیرا جاگیری، پوروا گروشرما، سدھا گنگولی، خان اطہر، رکن الدین، محمد ضیاء اور ساتھیوں نے مخدوم کا کلام ساز پر پیش کیا۔ کلچرل پروگرامس محترمہ لکشمی دیوی راج کی صدارت میں منعقد ہوتے رہے۔ میں ان سبھی پروگراموں میں شریک ہوتی رہی۔ جہاں مجھے بڑے قدآور دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور سیاستدانوں کو دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ میں نے ان اجلاسوں میں ڈاکٹر حسینی شاہد، پروفیسر زینت ساجدہ، کرشن چندر، آئی کے گجرال، عابد حسین، ایم ایف حسین، علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی، اقبال متین، جیلانی بانو، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، عابد علی خاں، محبوب حسین جگر، جی وینکٹ سوامی، پی شیوشنکر، ٹی انجیا، کے ایل مہندار، امولک رام، پروفیسر مغنی تبسم، مجتبیٰ حسین، سلیمان اریب، عالم خوندمیری، ڈاکٹر داؤد اشرف، بی نرسنگ راؤ، شمیم فیضی، زبیر رضوی، جہاں دار افسر، امجد باغی، احسن علی مرزا، سرینواس لاہوٹی، سعید بن محمد نقش، پروفیسر امیر عارفی، پروفیسر اشرف رفیع، فاطمہ عالم علی خاں، نجمہ نکہت، راشد آذر، راج کماری اندرادھن راج گیرجی، باجی جمال النساء، برج رانی گوڑ، پرمیلا تائی، ڈاکٹر بھارگوا، منوہر راج سکسینہ، پروفیسر رحمت یوسف زئی، پروفیسر فاطمہ پروین،

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، رحمٰن جامی، نصرت محی الدین، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر خالد سعید، پروفیسر عقیل ہاشمی، جاوید عالم، ایس سدھاکر ریڈی، عزیز پاشاہ، علی جاوید، علی ظہیر دیگر مفکرین سے جناب مخدوم محی الدین کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ ان حضرات کے خیال میں محنت اور محبت کے ممتاز ترقی پسند انقلابی شاعر جناب مخدوم محی الدین بیک وقت ٹریڈ یونین لیڈر، مجاہد آزادی، کمیونسٹ تحریک کے رہنما اور حیدرآبادی تہذیب وار دوادب کے حقیقی علمبردار تھے۔ ممتاز کمیونسٹ رہنما و ٹریڈ یونین لیڈر کامریڈ ایس اے ڈانگے نے لکھا ہے کہ ''میں حیدرآباد میں صرف دو چیزوں سے واقف ہوں ایک چارمینار اور دوسرے مخدوم'' جناب مخدوم محی الدین نے سامراجیت اور جاگیرداری نظام کے خلاف اپنی انقلابی تحریکوں کے بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جس کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ کامریڈ راج بہادر گوڑ کچھ اس طرح اظہار کرتے ہیں کہ ''مخدوم نے عالمی امن کے قیام میں اپنا اہم کردار ادا کیا وہ ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کے برسوں سکریٹری رہے ان کا ہیڈ کوارٹر ویانا تھا وہ سوشلسٹ سماج کو پروان چڑھانے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے اور آج بھی وہ جدوجہد جاری ہے۔ ملک کے موجودہ حالات میں مخدوم کے افکار و نظریات کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک کو فرقہ پرستی سے پاک کرنے کے لیے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنی ہوگی اور سیکولرازم کو مزید مستحکم کرتے ہوئے ہمہ رنگی کو برقرار رکھنا ہوگا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ عالمی شہرت یافتہ مصور جناب ایم ایف حسین نے ''ایک شام مخدوم کے نام'' اپنے سنیما گھر میں منعقد کی تھی جس میں

جناب مخدوم کی تصاویر کی نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا اور جناب مخدوم کے افراد خاندان کو خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ محترمہ دیوی رمنا مورتی نے اپنی سریلی آواز میں جناب مخدوم کے کلام کو ساز پر پیش کیا اور محترمہ نادرہ ببر (سجاد ظہیر کی صاحبزادی) اور ڈاکٹر آمنہ انصاری نے جناب مخدوم کے کلام کو تحت اللفظ میں پیش کیا۔ جناب ایم ایف حسین نے جناب مخدوم کے اشعار پر اپنے اسکیچز بنا کر نمائش کے لیے پیش کیے یہ شام میرے لیے بڑی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ ایم ایف حسین نے میری بیٹی ندا النصر کا اسکیچ بھی بنایا۔ اس موقع پر مخدوم کی آواز میں چاند تاروں کا بن نظم بھی سنائی گئی۔ مشہور فلم اسٹار اور مرکزی وزیر برائے اسپورٹس جناب سنیل دت نے بھی ''یادِ مخدوم'' کا اہتمام باغ عامہ، اوپن ایر تھیٹر میں کیا۔ اس موقع پر سنیل دت نے کہا کہ میں نے مخدوم کی اجازت کے بغیر اپنی فلم میں ان کے اشعار شامل کر لیے تھے۔ انہوں نے اس کا معاوضہ بھی نہیں لیا یہ مجھ پر ایک بڑا بوجھ محسوس ہو رہا تھا میں آج یہ تقریب منعقد کر کے اپنے بوجھ کو اتارنا چاہتا ہوں۔ آج مخدوم ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن میں ان کے افرادِ خاندان کو اس محفل میں شریک کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ استاد وٹھل راؤ اور ان کے ساتھیوں نے مخدوم کی مشہور نظم ''چاند تاروں کا بن'' جس کی دھن مشہور میوزک ڈائرکٹر جناب اقبال قریشی نے بنائی تھی، وٹھل راؤ اور ان کے ساتھیوں نے سنا کر سماع باندھ دیا۔ اس پروگرام کے چند دن بعد ہی سنیل دت کا انتقال ہو گیا۔ مجھے میری دادی ماں نے بتایا کہ تمہارے چچا باوا کا پورا نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین حذری تھا۔ ان کا گھرانہ علمی ادبی اور مذہبی رہا۔ ان کے آبا و اجداد حضرت شیخ ابوسعید

الخذری بن مالک بن سنسان بن نعمان حضور اکرمؐ کے صحابی تھے ان کا تعلق انصار قبیلے خزرج سے تھا۔ ان کا خاندان ترکِ وطن کر کے عراق، سمرقند، بخارا ترکستان اور ایران کا سفر کرتے ہوئے ہندوستان آیا اور اعظم گڑھ میں قیام پذیر ہوا۔ انہوں نے مغلوں کی فوج میں ملازمت اختیار کی بعد میں دکن کا رخ کیا۔ جناب مخدوم محی الدین کے پردادا حضرت مخدوم محی الدین نے بیدر سے حیدرآباد کے قریب موضع منمول پٹن چیرو کے قریب اپنے افراد خاندان کے ساتھ قیام کیا۔ حضرت محمد احسن الدین، جناب مخدوم محی الدین کے حقیقی دادا تھے ان کا گھرانہ استادوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ جناب محمد غوث محی الدین، جناب مخدوم محی الدین کے والد تھے۔ جناب سید جعفر علی مخدوم کے نانا تھے وہ 1857ء میں دہلی کی تباہی کے واقعات کی وجہ سے دہلی سے دکن چلے آئے اور میدک میں قیام کیا۔ جناب سید جعفر علی کی دو لڑکیاں تھیں دوسری لڑکی عمدہ بیگم جناب مخدوم محی الدین کی والدہ تھیں۔ جناب مخدوم محی الدین کی چھوٹی بہن آمینہ بیگم جو میدک گرلز اسکول میں درس و تدریس سے وابستہ تھیں۔ جناب مخدوم کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اتفاقِ رائے نہیں ہے۔ لیکن جناب نظام الدین کے ریکارڈ کے مطابق 4 فروری 1908ء کو اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے۔ 1929ء میں جناب مخدوم نے سنگاریڈی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اور حیدرآباد کے دھرماونت ہائی اسکول میں بھی تعلیم حاصل کی۔ 1932ء میں انٹرمیڈیٹ اور 1934ء میں بی اے، 1936ء میں ایم اے کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد تلاشِ معاش میں مصروف ہو گئے۔ وہ ابتداء میں ٹیوشن کرنے لگے انہیں ایک دلچسپ

کام ملا ایک نواب صاحب کسی اینگلو انڈین لڑکی سے عشق کرتے تھے وہ معاوضہ دے کر جناب مخدوم سے انگریزی میں عشقیہ خطوط لکھوایا کرتے تھے۔ جناب مخدوم ان دنوں سلطان بازار کی ہری مسجد میں قیام پذیر تھے۔ ان کے دوست نور الہدیٰ کے ساتھ مل کر فلمی ستاروں کی تصویریں فروخت کرنے لگے بعد میں یہ کاروبار بند کر دیا اور مشیر دکن، الاعظم اور روزنامہ پیام میں مترجم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ دو مہینوں کے لیے دفتر دیوانی ملکی و مال میں بھی کام انجام دیا۔ 1939 میں سٹی کالج حیدرآباد میں بحیثیت اردو لکچرر تقرر ہوا۔ 1943ء میں سٹی کالج میں ملازمت سے مستعفی ہوئے اور عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور روپوشی اختیار کی۔ 1941ء میں بغاوت کے الزام میں گرفتار ہوئے تین ماہ کی سزا ہوئی۔ 1944ء میں بھی تین ماہ کی سزا ہوئی۔ 1945ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے جلسہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ بعد میں رہائی عمل میں آئی۔ 1951ء میں ایڈیکمینٹ میں گرفتار ہوئے اور آزاد ہندوستان کے پہلے انتخابات 1952ء میں اسمبلی اور پارلیمنٹ کے لئے مقابلہ کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ حضور نگر کے ضمنی انتخاب میں کامیاب ہو کر ایم ایل اے ہوئے اور 1956ء میں ایم ایل سی کے لیے منتخب ہو کر اپوزیشن لیڈر کے فرائض انجام دیئے اور انتقال تک ایم ایل سی رہے۔ جناب مخدوم محی الدین عالمی امن اور دنیا کے مزدوروں کی عالم گیر یونین ڈبلیو ایف ٹی یو یعنی ورلڈ فیڈریشن آف ٹریڈ یونین کی کانفرنس میں ہندوستان کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کی اور روس، ایشیاء، آفریقہ، مشرقی و مغربی یورپ کے کئی ممالک کا سفر 9 مارچ سے 29 جولائی تک جاری رہا۔ جناب مخدوم محی الدین نے ڈرامہ نگار اور اداکار کی حیثیت سے بھی اپنا لوہا منوایا۔ برنارڈ شاہ کے ڈرامہ ''وڈورس ہاؤز'' کے خطوط پر اردو میں ڈرامہ ''ہوش کے ناخن'' جناب مخدوم محی الدین او جناب میر حسن نے تحریر کیا۔ یہ ڈرامہ حیدرآباد میں رابندر ناتھ ٹیگور کی موجودگی میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور

اس ڈرامے میں جناب مخدوم کے کردار سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے جناب مخدوم کی ستائش کی اور انہیں شانتی نکیتن آنے کی دعوت دی۔ 1935ء میں ایک ڈرامہ ''مرشد'' کوئٹہ کے زلزلے کے متاثرین کی امداد کے لیے اسٹیج کیا گیا تھا جس میں مرشد کا کردار جناب مخدوم انجام دے رہے تھے انہوں نے جو میک اپ کیا تھا اس میں حضرت خواجہ حسن نظامی سے مماثلت پائی جاتی تھی۔ اس ڈرامہ کو دیکھنے کے لئے نظام آف حیدرآباد بھی تشریف لائے تھے۔ جناب مخدوم محی الدین کی ہندوستان کے عظیم شخصیتوں کے ساتھ ملاقاتیں رہیں۔ 1930 میں گاندھی جی سے ملاقات کی اور پنڈت جواہر لال نہرو سے سروجنی نائیڈو کے گھر پر جناب مخدوم کی ملاقات ہوئی، 1935 میں سروجنی نائیڈو نے رابندر ناتھ ٹیگور سے جناب مخدوم کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ جناب مخدوم کا پہلا مجموعہ کلام 1944 میں ''سرخ سویرا'' دکن بک ڈپو سے شائع ہوا۔ 1961ء میں دوسرا شعری مجموعہ ''گلِ تر''۔ تیسرا شعری مجموعہ 1966ء میں جشن مخدوم کمیٹی کی جانب سے ''بساطِ رقص'' شائع ہوا۔ پھر انتقال سے پہلے کے کلام کو بساطِ رقص میں شامل کر کے اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش اب تک چار ایڈیشن شائع کر چکی ہے۔ ہندی میں ''سرمایہ مخدوم'' کے نام سے ششی نارائن سوادھین اور نصرت محی الدین نے مرتب کیا جس کو وانی پرکاشن نئی دہلی نے شائع کیا۔ وشال آندھرا کی جانب سے جناب مخدوم کا کلام تلگو میں شائع ہو چکا ہے۔ ساہتیہ اکیڈیمی کی جانب سے مخدوم محی الدین کی نظموں کا انگریزی ترجمہ انتھالوجی میں شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح روسی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی مخدوم کا کلام شائع ہوا۔ میں نے بھی جناب مخدوم محی الدین کی دو نظمیں ''سپاہی'' اور ''آج کی رات نہ جا'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

میں پروفیسر زینت ساجدہ کے حسب ذیل جملوں پر اپنی بات کو ختم کرنا چاہتی ہوں:

''مخدوم کو اپنے بلیو بلیک حسن پر بڑا ناز ہے۔ اب جو بنے بھائی نے اسے اجنتا کی

مورتی قرار دیا ہے تو خدا جانے اور کیا مزاج دکھائے، پہلے ہی سے وہ اپنے آپ کو دکن کی سنگلاخ چٹانوں سے تراشا ہوا صنم سمجھتا ہے۔ مگر معلوم نہیں ہنسنے، بولنے کھلکھلانے والا مخدوم شعر سناتا ہے تو مجھے وہ بالکل تنہا نظر آتا ہے، تنہا مسافر، شب گزیدہ جو اپنے دل کا چراغ جلائے سب کے لیے راہ تلاش کر رہا ہو۔ آپ اس کی باتیں سن کر ہنستے ہوں گے مگر شعر سن کر دل جیسے پگھلنے لگتا ہے۔ اسی لیے کافر ہے، کمینہ ہے، سب کچھ ہے مگر۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

☆☆☆

پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
سابق صدر شعبۂ اُردو، ایس وی یونیورسٹی، تروپتی

مخدوم، شاعر نبض شناس ۔۔۔ رپورتاژ

اردو دنیا میں اس سال مخدوم صدی تقاریب منائی جا رہی ہیں۔ اور ممالک کے اردو حلقوں نے بھی ان تقاریب کا اہتمام کیا ہوگا۔ ادھر ہندوستان میں، خاص طور پر دہلی اور حیدرآباد میں مخدوم تقاریب کا انعقاد کیا۔ دیگر اردو اداروں نے بھی اپنے انداز سے مخدوم کو یاد کیا۔ مخدوم کو یاد کریں تو محسوس ہوتا ہے جیسے ہم خود اپنے آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ اپنے ماضی، حال اور مستقبل میں زیست کر رہے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں کہ مخدوم کا وطن بھی حیدرآباد تھا۔ جی نہیں مخدوم کا وطن نہ حیدرآباد نہ تھا دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند! مخدوم کا وطن تو ہر وہ دل تھا جس میں سچے رومانی اور انقلابی جذبات پرورش پا رہے تھے۔ جن میں آج بھی انسان دوستی کے چراغ جلتے ہیں اور محبت اور محنت کے پھول کھلتے ہیں۔ مخدوم نے رومانی شاعری بھی کی اور بڑی خوب صورت رومانی شاعری کہ اردو کی رومانی شاعری کے کسی بھی انتخاب میں ان کی چند نظمیں تو ضرور شامل ہوں گی۔ مخدوم کی رومانی شاعری میں بعض لپکے اور دل کو چھو لینے والے اشعار ملتے ہیں جن کا روایتی رومانی شاعری سے کوئی علاقہ نہیں بنتا۔ مخدوم کی انفرادیت ان میں جھلکتی ہے تو ان کے کلام میں باغیانہ جذبات، انقلابی رجحانات اور انسان

دوستی کی خوشبو ملتی ہے۔ مخدوم کے ہاں رومانیت بھی ہے، انقلاب اور احتجاج کی گونج بھی۔ مخدوم کو محبت اور محنت کا شاعر اسی لیے کہا گیا ہے۔ اسی محبت اور محنت کے شاعر کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے ایک روزہ سمینار میں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس سمینار کا اہتمام اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب اور ثقافت نے کیا تھا جس کے لیے یونیورسٹی کے فعال وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان اور مرکز برائے اردو زبان، ادب اور ثقافت کے ڈپٹی ڈائرکٹر وانچارج ڈاکٹر شجاعت علی راشد ہم سب کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ پرووائس چانسلر پروفیسر کے آر اقبال احمد کے خیر مقدمی کلمات سے سمینار کے افتتاحی اجلاس کا آغاز ہوا۔ انھوں نے کہا کہ مخدوم اردو دنیا کا جانا پہچانا نام ہے اور نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی سطح پر بھی لوگ مخدوم کی شخصیت، خدمات اور ان کی شاعری سے آگہی رکھتے ہیں۔ مخدوم آزادی سے قبل سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزما رہے تو آزادی کے بعد کسانوں، مزدوروں اور مظلوموں کے حقوق کے لیے اپنی لڑائی جاری رکھی۔ مخدوم کی لڑائی فاشسٹ طاقتوں کے خلاف اور امن پسند لوگوں کے حق میں تھی۔ پروفیسر اقبال احمد نے مخدوم کے حالاتِ زندگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پروفیسر شمیم جیراج پوری نے سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر پٹھان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ پٹھان صاحب کی سرگرمیوں سے ہمارے اسلاف کے کارنامے نوجوان نسل تک پہنچ سکیں گے۔ شمیم صاحب نے مخدوم کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ناموافق حالات کے باوجود مخدوم نے زندگی کی دوڑ میں حصہ لیا۔ وہ ایک شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج انسان تھے۔ انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں بھی حصہ لیا، ڈرامے بھی لکھے، افسانے بھی تحریر کیے اور ترجمے بھی کیے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا مقام نہایت بلند ہے۔ اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر

پروفیسر پٹھان نے جو اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے کہا کہ مخدوم ترقی پسند تحریک کے صفِ اوّل کے شاعر تھے۔ وہ ایک عظیم شخصیت تھے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء رومانی شاعری سے کی اور پھر انقلابی گیت گانے لگے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے کالج کی ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور کمیونسٹ پارٹی میں شرکت کی۔ ان کے کلام میں صدائے احتجاج بھی ہے اور نغمگی اور شعریت بھی۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر پی پرکاش نے یونیورسٹی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور شرکائے سمینار کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وائس چانسلر پٹھان کی یونیورسٹی کی ترقی کے لیے کوششوں اور ڈاکٹر شجاعت علی راشد کو سمینار کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ افتتاحی اجلاس کے کنوینر ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے عمدگی کے ساتھ کارروائی چلائی۔ سمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی۔ اس اجلاس کی مہمان اعزازی پروفیسر سیدہ جعفر تھیں۔ ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے ''مخدوم کی شاعری میں اسلامی تلمیحات روایات اور تصورات کا تفاعل'' کے زیرعنوان مقالہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ مخدوم نے راسخ العقیدہ کمیونسٹ ہونے کے باوجود اسلامی تلمیحات اور روایات وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔ پروفیسر فاطمہ پروین نے ''مخدوم کی شاعری میں اسلامی تلمیحات و اشارات'' کے زیرعنوان مقالہ میں کہا کہ مخدوم کے کلام میں تلمیحات اور استعارات وغیرہ کا رشتہ مذہب سے جا ملتا ہے حالاں کہ مخدوم عملی زندگی میں کمیونسٹ تھے۔ پروفیسر خالد سعید نے اپنے مقالہ ''مخدوم: شاعر شکستِ نور و صدا'' میں نہایت تفصیل اور گہرائی کے ساتھ مخدوم کے فکر و فن کا احاطہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ''سرخ سویرا'' سے ''بساطِ رقص'' تک ہر مجموعہ میں مخدوم کی ترقی پسندی بتدریج گھٹتی گئی ہے۔ ''سرخ سویرا'' میں ترقی پسندی کی جو شدت ہے آگے چل کر کم ہوئی ہے اور بساطِ رقص میں تو جدیدیت کی پرچھائیاں

ملتی ہیں۔مخدوم نے اردو شاعری کو بہت دیا خاص طور پر ان کے ہاں محبوب کا ایک نیا پیکر ملتا ہے۔ پروفیسر خالد سعید نے کہا کہ مخدوم کی غزلوں میں تنہائی اور اجنبیت کا احساس شدید ہے۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی نے مخدوم کی شعری جمالیات پر اظہار خیال کیا۔اپنے مقالہ میں انھوں نے کہا کہ مخدوم کا نام حیدرآباد سے اس طرح جڑا ہوا ہے جیسے چار مینار کا نام حیدرآباد سے۔ پروفیسر یوسف زئی کے بموجب مخدوم کے کلام میں احساسات اور جذبات کی وسیع لہریں ملتی ہیں۔ان کی جمالیات مشرقی اقدار سے مملو ہے۔ پروفیسر وہاب قیصر کے مقالہ کا عنوان تھا ''مخدوم رجائیت کی منفرد آواز''۔انھوں نے کہا کہ مخدوم کے پہلے مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' میں رجائیت اور انقلابی فکر ہے لیکن بعدازاں ان کی رجائیت کم ہونے لگتی ہے۔مخدوم نے فرسودہ روایات کے خلاف بھی لکھا اور انقلابی نظمیں بھی کہیں پروفیسر سیدہ جعفر نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے مخاطب کیا اور کہا کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن شاعروں نے اردو شاعری کی سمت و رفتار کا تعین کیا ان میں مخدوم بھی شامل ہیں۔ مخدوم کی ابتدائی دور کی منظومات پر ٹیگور کا اثر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے کہا کہ مخدوم انسان دوست اور احترام آدمیت کا شاعر تھا۔انھوں نے اپنی شاعری کی ابتداء رومانیت سے کی، اشتراکیت کی طرف آئے اور آخر میں ان کے ہاں جدیدیت کا اثر بھی ملتا ہے۔انھوں نے اپنے کلام میں عصری مسائل کو پیش کیا۔صدر جلسہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اردو یونیورسٹی کی ترقی کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں پر اظہار خوشنودی کرتے ہوئے وائس چانسلر اور ان کے رفقاء کو مبارکباد دی۔ انھوں نے اس اجلاس میں پیش کیے گئے مقالوں کی ستائش کی۔انھوں نے کہا کہ مخدوم ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے۔انھوں نے عشقیہ شاعری بھی کی اور انقلابی شاعری بھی۔ان کے ہاں گھن گرج کی شاعری بھی ہے۔مختصر

یہ کہ ترقی پسند شاعری میں مخدوم کا اہم کردار رہا ہے۔ڈاکٹر نکہت جہاں نے اس سیشن کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔ظہرانہ کے بعد دوسرے ادبی اجلاس کی صدارت پدم شری مجتبیٰ حسین نے کی۔ ۔ڈاکٹر عسکری صفدر نے اپنے مقالہ میں کہا کہ مخدوم نے اپنی ساری زندگی محبت اور محنت کی نذر کی۔انھوں نے ایک نئے نظام کا خواب دیکھا جو وقت کی ضرورت بھی تھی۔اس طرح مخدوم کی شاعری آنے والے دور کی نقیب بن جاتی ہے۔ پروفیسر مجید بیدار نے مقالہ ''مخدوم کی شاعری میں پیکر تراشی'' میں کہا کہ مخدوم نے اپنی غزلوں ہی میں نہیں اپنی نظموں میں بھی خوب صورت پیکر تراشے ہیں۔پیکر تراشی کرنے والے شاعروں میں مخدوم کو امتیاز حاصل ہے۔ پروفیسر ریحانہ سلطانہ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مخدوم کی شاعری کو وہ مقام نہیں ملا جس کا وہ استحقاق رکھتی ہے۔مخدوم کی تحریک آج بھی ہے، مخدوم کا مقصد ابھی حاصل نہیں ہوا ہے۔ پروفیسر بیگ احساس نے مخدوم کی شخصیت کے چند پہلو کے زیرعنوان مقالہ میں مخدوم کی زندگی کے بعض رخوں کو دلچسپ انداز میں پیش کیا۔انھوں نے کہا کہ مخدوم نے سادہ زندگی گزاری۔انھوں نے اپنی محرومیوں کو دوستوں کی محفلوں اور محروم لوگوں کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے پورا کیا۔ پروفیسر آمنہ کشور نے اپنے انگریزی مقالہ ''MAKHDOOM - AS A MINIMALIST POET'' میں کہا کہ مخدوم شاعر انسانیت ہیں ان کی شاعری حقیقت پسندی اور عصری حسیت کی حامل ہے۔ پروفیسر آمنہ نے مخدوم کے کلام کے اچھے ایڈیشنوں کی اشاعت پر زور دیا۔سلیمان اطہر جاوید نے مخدوم کی انقلابی شاعری پر مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر اشرف رفیع نے ''تلاش مخدوم : تقاضے اور تجاویز'' کے بعنوان اپنے مقالہ میں مختلف تجاویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ مخدوم کے طالب علمی کے دور کے لطیفوں ، ان کے سیاسی افکار ، ان کے بارے میں منعقد ہونے والے تعزیتی

جلسوں اوران کے توقیت نامہ کے بارے میں گہرائی اور گیرائی سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ڈاکٹرعقیل ہاشمی نے مقالہ ''یارِغم گسار کی بات'' میں کہا کہ مخدوم دکن کا وہ پہلا شاعر ہے جس نے روایتی بندھنوں کوتوڑا۔انھوں نے کہا کہ مخدوم کا لہجہ چونکا دینے والا اور قاری کے ذہن پر چھا جانے والا ہے۔مخدوم نے اپنی شاعری کی طاقت سے تین نسلوں کو متاثر کیا۔ مقبول عوامی قائد ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے جو اپنی علالت کے باعث اس سمینار میں شرکت نہیں کر سکے اپنے پیام میں کہا کہ مخدوم کا ہنر یہ تھا کہ وہ قلم کوتلوار اور تلوار کوقلم میں تبدیل کر سکتے تھے۔گوڑ صاحب نے کہا کہ مخدوم شاعرنہیں اپنے دور کا شعری مزاج بلکہ عصری شاعری کا پیمانہ تھے۔پروفیسر محمد ظفرالدین نے ڈاکٹر گوڑ کا پیام سنایا۔مجتبیٰ حسین نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ مخدوم نے اپنی شاعری کی ابتداء مزاحیہ شاعری سے کی۔ترقی پسندوں میں مخدوم کا درجہ نہایت بلند ہے۔انھوں نے زندگی اورادب کو بہت کچھ دیا ہے۔مخدوم ہمارے درمیان ہمیشہ زندہ رہیں گے۔پدم شری مجتبیٰ حسین نے اردو یونیورسٹی میں مخدوم چیر قائم کرنے کی تجویز کی اور یہ بھی کہا کہ مخدوم کے ہم عصروں عاقل علی خاں، اشفاق حسین اورظفرالحسن وغیرہ پر بھی کام ہونا چاہیے۔مخدوم محی الدین کے صاحبزادے جناب نصرت محی الدین بھی اس اجلاس میں موجود تھے۔ڈپٹی ڈائرکٹر اورانچارج مرکز اردو زبان، ادب وثقافت ڈاکٹر شجاعت علی راشد کے شکریہ پر سمینار اختتام کو پہنچا۔ڈاکٹر شمس الہدی دریابادی نے اس اجلاس کی کارروائی چلائی۔24 اپریل کوایک شام مخدوم کے نام ''شامِ نغمہ'' کا شام چھ بجے انعقاد عمل میں لایا گیا۔ریاستی وزیر توانائی و اقلیتی بہبود جناب محمد علی شبیر نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔پروفیسر محمد شمیم جے راجپوری بانی وسابق وائس چانسلر اُردو یونیورسٹی اس پروگرام کے مہمان اعزازی تھے۔پروفیسر اے ایم پٹھان وائس چانسلر یونیورسٹی کی غیر حاضری میں

پروفیسر کے آر اقبال احمد پرووائس چانسلر یونیورسٹی نے صدارت کی۔رجسٹرار یونیورسٹی ڈاکٹر پی پرکاش نے یونیورسٹی کی تعلیمی وتعمیری سرگرمیوں پر تفصیلی رپورٹ پیش کی۔اس کے بعد شامِ نغمہ میں ممتاز گلوکار جناب وٹھل راو، محترمہ جسبیر کور، جناب خان اطہر، جناب رکن الدین اورمحترمہ پوروا گروشرما نے منتخبہ کلام مخدوم ساز پر پیش کیا۔ستار پر اُستاد مجتبیٰ علی خان، طبلے پر جناب محمد نجم الدین قادری جاوید اور ہارمونیم پر پنڈت رتن لال شرما نے ان کی سنگت کی۔ اس طرح رات دیر گئے اس رنگارنگ شامِ نغمہ اور یونیورسٹی کے دس سالہ جشن یوم تاسیس کے ضمن میں منعقدہ دوروزہ قومی تقاریب کا کنوینر وانچارج مرکز برائے اُردو زبان، ادب و ثقافت ڈاکٹر شجاعت علی راشد کے کلمات تشکر پر انتہائی کامیابی کے ساتھ اختتام عمل میں آیا۔

☆☆☆

جناب مجتبیٰ حسین
نامور مزاح نگار

مخدوم، مخدوم اور مزید مخدوم۔۔۔ رپورتاژ

مخدوم محی الدین کو ہم سے بچھڑے ہوئے چالیس برس بیت گئے اور ان چالیس برسوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا ہو جب ہمیں مخدوم کی یاد نہ آئی ہو یا کہیں ان کا ذکر نہ ہوا ہو۔ گویا مخدوم کی یاد ایک تسلسل کا نام ہے، اردو شاعری اور حیدرآبادی تہذیب کے جاری و ساری رہنے کی ایک روشن علامت ہے۔ مخدوم کی یاد کا یہ معاملہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہا تھا کہ اردو کے کسی محقق نے (جو کبھی نچلے بیٹھنا بالکل نہیں جانتے) مخدوم محی الدین کی تاریخ پیدائش کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا کہ اگر مخدوم آج زندہ ہوتے تو فبروری 2008ء میں پورے سو برس کے ہو جاتے۔ چنانچہ ملک بھر میں اچانک مخدوم کی صد سالہ تقاریب کے انعقاد کی فصل پک کر تیار ہوگئی جسے کاٹنے کی غرض سے اردو کے اساتذہ، ناقد، ادیب اور شاعر ہوائی جہازوں اور ٹرینوں میں بیٹھ کر جگہ جگہ جانے لگے۔ سمینار ہو رہے ہیں، مذاکرے ہو رہے ہیں، مشاعرے ہو رہے ہیں اور تہذیبی پروگرام کی آڑ میں بدتہذیبی کے مظاہرے بھی ہونے لگے ہیں۔ اب آپ سے کیا چھپائیں کہ پچھلے تین مہینوں کے عرصہ میں خود ہم نے مخدوم کے سلسلہ میں پانچ سمیناروں اور دو تہذیبی پروگراموں میں شرکت کی غرض سے دہلی، کلکتہ اور بیگوسرائے

وغیرہ کے سفر کیے ہیں۔ صد سالہ تقاریب منانا اچھی بات ہے لیکن یہ خدشہ بھی لگا رہتا ہے کہ اتنا سب کچھ یاد کرنے کے بعد کہیں متعلقہ فن کار کو اس کی دو صد سالہ تقاریب کے موقع پر یاد ہی نہ کیا جائے۔ جیسے گاندھی جی کو ہم ہر سال ''گاندھی جینتی'' کے موقع پر ایک دن یاد کر کے انھیں سال بھر پھر طاق پر سجا کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسی منظّم یاد سے بہتر تو یہ ہے کہ مخدوم ہر روز چپکے سے یوں یاد آتے رہیں جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے۔ دہلی کا سمینار یقیناً ایک یادگار سمینار تھا جس میں ملک بھر سے اکابرین ادب نے شرکت کی اور مخدوم کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا۔ پچھلے ہفتہ مولانا آزاد یونیورسٹی کے مرکز برائے اردو زبان، ادب و ثقافت کی جانب سے ''مخدوم۔ شاعر نبض شناس'' کے عنوان سے ایک قومی سمینار حیدرآباد میں منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، سابق ڈین جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی اور پروفیسر شمیم جئے راج پوری، بانی وائس چانسلر مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے علاوہ پروفیسر اے ایم پٹھان، پروفیسر اقبال احمد، پروفیسر سیدہ جعفر، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر فاطمہ پروین، پروفیسر خالد سعید، پروفیسر رحمت یوسف زئی، پروفیسر وہاب قیصر، ڈاکٹر عسکری صفدر، ڈاکٹر مجید بیدار، پروفیسر ریحانہ سلطانہ، پروفیسر بیگ احساس، پروفیسر آمنہ کشور، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر اشرف رفیع اور پروفیسر عقیل ہاشمی وغیرہ نے شرکت کی۔

پچھلے تین مہینوں کے دوران میں مخدوم کے سلسلہ میں منعقد ہونے والی مختلف النوع تقاریب میں شرکت کرنے کا ایک فائدہ ہمیں یہ ضرور ہوا کہ مخدوم محی الدین کا وہ سارا کلام بلکہ مجموعہ کلام جو ہمیں پہلے ہی سے زبانی یاد تھا از سر نو زبانی یاد ہو گیا۔ یہ ضرور ہے کہ دوبارہ یاد کرتے وقت حافظہ میں تلفظ کی غلطیوں میں کچھ اضافہ ہو گیا کیوں کہ ہم نے ابتداء میں مخدوم کا کلام خود مخدوم کی زبانی سن کر اپنے طور پر منہ زبانی یاد کیا تھا۔ اب رائج الوقت اکابرین ادب کے تلفظ کی بعض غلطیاں بھی ہمارے حافظہ کا حصہ بن گئی ہیں۔ انسان کا حافظہ بھی بڑا ابن الوقت

ہے۔مولانا آزاد یونیورسٹی کے سمینار کی خوبی یہ تھی کہ اس میں جن مقالہ نگار حضرات نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں سے اکثر نے اپنے بچپن یا نوجوانی میں مخدوم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا ان سے باتیں کی تھیں۔اس لیے ان مقالوں میں ایک شخصی وابستگی کے ساتھ ساتھ گہری عقیدت کی جھلک بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔بعض مقالہ نگار حضرات جیسے نسیم الدین فریس اور فاطمہ پروین نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مخدوم کے کلام میں اسلامی تلمیحات اور استعارات کے استعمال کی نشان دہی کی۔ یہ موقع نہیں ہے اور ہمارا منصب بھی نہیں ہے کہ ہم سارے مقالہ نگار حضرات کے مقالوں پر تبصرہ کریں۔تاہم اپنے مزاج اور مزاح دونوں کی مناسبت سے پروفیسر خالد سعید کے مقالے کا ذکر کرنا چاہیں گے جسے سن کر ہمیں اندازہ ہوا کہ جس طرح مخدوم اپنے آپ کو محنت اور محبت کا شاعر کہتے تھے اسی طرح ہمیں خالد سعید بھی محنت اور محبت کے ناقد نظر آئے۔ انھوں نے اپنے مقالے پر جو محنت کی تھی اس کا اندازہ ان کے مقالے کے مقوی مخطوطے کو دیکھ کر ہی لگایا جا سکتا تھا۔ یوں لگا جیسے وہ سمینار میں مقالہ پڑھنے نہیں بلکہ پارلیمنٹ میں مرکزی بجٹ پیش کرنے آئے ہوں۔ ہمارے ذہن میں بجٹ کا خیال اس لیے بھی آیا کہ خالد سعید اپنے ساتھ مخدوم کی رومانی شاعری اور ترقی پسند شاعری کا ایک بیالنس شیٹ یا جدول بھی مرتب کر کے لے آئے تھے۔جس میں سرخ سویرا، گل تر اور بساط رقص کے سارے کلام کا احاطہ کیا گیا تھا۔ یوں سمجھیے کہ اس جدول کے مطابق انھوں نے مخدوم کے رومانی کلام کو آمدنی کی مد میں اور ان کی ترقی پسند شاعری کو خسارے کی مد میں شامل کیا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ مخدوم رومانی شاعر زیادہ اور ترقی پسند شاعر کم تھے۔گویا خالد سعید نے اپنی دانست میں مخدوم کی شاعری کے حوالہ سے منافع کا بجٹ پیش کیا تھا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے اور انھوں نے مقالے کی طوالت کو مختصر کرنے پر زور دیا جس کے باعث خالد سعید اپنے مقالے کے بہت سے حصے پڑھ

نہیں پائے۔تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ خالد سعید نے، جیسا کہ ان کی عادت ہے، ایک نئے زاویہ سے مخدوم کی شاعری کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔اب ہمیں اس پورے مقالے کی اشاعت کا انتظار رہے گا۔سمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت خاکسار نے کی جس میں پروفیسر بیگ احساس نے چند حوالوں سے مخدوم کی شخصیت کے بعض ایسے گوشوں کو اُجاگر کیا جن کی طرف دیگر مقالہ نگار حضرات کی نظر نہیں گئی تھی۔ پروفیسر شمیم جئے راج پوری اس اجلاس کے مہمان خصوصی تھے۔مقالہ اتنا اثر انگیز تھا کہ شمیم جئے راج پوری، ہماری یعنی صدر اجلاس کی اجازت لیے بغیر ہی، اپنی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو لے آئے اور جیسے ہی بیگ احساس نے اپنا مقالہ ختم کیا پھر ہم سے اجازت لیے بغیر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے حاضرین سے کہا کہ اس مقالے میں اٹھائے نکات پر مزید کام کرنے کی ضروت ہے تاکہ مخدوم کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ پروفیسر اشرف رفیع نے بھی اس اجلاس میں مخدوم پر کام کرنے کے سلسلے میں کئی اہم عملی تجاویز پیش کیں اور کوئی ایسی تجویز نہیں چھوڑی جسے بحیثیت صدر ہم اجلاس میں پیش کر سکیں۔ تاہم کرسی صدارت پر بیٹھنے کا ہی فیض تھا کہ ہم نے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ مولانا آزاد یونیورسٹی میں ایک ''مخدوم چیر'' کا قیام عمل میں لے آئیں تاکہ مخدوم، ان کے فن، ان کے عہد اور ان کے معاصرین پر سیر حاصل کام ہو سکے۔ہم نے حسب عادت یہ بھی کہا کہ ''مخدوم چیر'' کو سچ مچ Chair سمجھیں اور اسے Easy Chair بالکل نہ بننے دیں۔اس کامیاب سمینار کے انعقاد کے لیے ڈاکٹر شجاعت علی راشد مبارکباد کے مستحق ہیں۔

☆☆☆

4. Koyi taalu me meri baith ke chillata hai
Dank pe dank lagaata hai mere dil ke qareeb
Aage badhta hun to qadmon se chimat jata hai
Mujhe jaane hi nahin deta hai manzil ke qareeb.

Lastly the ever popular sweet two lines:

Hayat leke chalo kayenaat leke chalo
Chalo to saare Zamaane ko saath leke chalo.

The form in all these pieces is minimal; but the range of emotions is varied. There is poetic posturing, interactive dynamism, deep anguish, romantic langour and unlimited possibility.

Here is a poet who can be placed alongside the best. The critics and scholars need to break out of niche criticism and apply alternate evaluative yardsticks to judge this versatile poet.

☆☆☆

canonization of the poet's work seems implicity in order; to the sad exclusion of some differently cast poetic pieces. During my reading of Makhdoom's anthology, I fell upon the little pieces, tucked away as footnotes or space-savers on the pages containing the more popular poems. Telling pieces, all. The subject matter is varied and the form is varied. Most of them are included in the Second collection titled ***Gul-e-tar***. There is no indication of dates or context. I am sure Makhdoom scholarship is alread paying attention to this lacuna.

Makhdoom admirers and scholars should take up the project of bringing out a better researched edition of the complete works of Makhdoom with each poem occupying the place that it deserves. If critical opinion agrees that some of these should be moved to the status of minor poems etc. that can be a well recognized and well argued opinion too. The size of the poem should not be allowed to go begging for space necessarily because of the printing-editing dynamics.

Here is a small sample of the tiny nuggets that appealed to me.

Each of these minimalist expressions encompasses a whole world while revolving within a minute experiential spectrum.

1. Aye husn ke tajdaar aaya aaya
Aye Yaar, Aye Ghamgusaar, aaya aaya
O kaare jahan door ho lillah na chhaidh
Haan humsafare bahaar aaya aaya.

2. Baat kya thi zikr kis kaa thaa ke hangame nishaat
Muskuraanevali aankhen hichkiyaan lene lageen

3. Meri aankhon ki zubaan aur mere dil ki awaz
Na samajhne ke liye hai na sunane ke liye.

For all his much praised penchant for the long poem. it is the mostly untitled short pieces that shine like nuggets. These minimalist poems are rich with condensed meaning, and textured feel. They are spontaneous and brief, finish as soon as they begin; surprising the reader with their quicksilver finish.

As a movement, minimalism started as an alternate new movement in plastic arts and music. In poetry the movement was overshadowed by many other 20th Century movements. The school represented a protest against convention-bound, rigid and restrictive approach to poetry. The main thesis of minimalism was that poetry should be more authentic, homespun, contemporary and accessible. It perhaps takes its cues from Dadaism and the Japanese Haiku. Minimalist poets focus upon use of bare words or phrases, rearranging them and allowing them to disclose the unexpected in themselves. The minimalist poem is slight in size but provocative, exploiting the power of language, as does all poetry. Centrally, it strips artificiality and is dedicatedly anti-emotional on the surface.

Among notable names in English poetry are the two American poets Emily Dickinson and William Carlos Williams, the latter being a self consious practitioner of the form. A recent British poet who used this style more spontaneously was Kathleen Raine, the well-known Blake scholar.

Makhdoom's works has been, in the last forty odd years subjected to critical slants which are by and large bound by conventional insights. There is a focus on the same poems again and again. A sort of mini

To borrow a phrase from Emily Dickinson once again, the poem for Makhdoom, is always an address to the world. In his Preface to his volume of poetry, an acutely reader-conscious Makhdom speaks of the poet's anxiety to make meaning; this anxiety forcing the poet into being a changeling chameleon in search of true colours. And, what of the reader? The reader also shuns his own personality during the act of reading. The poet and the reader both bring to bear the world of their own experience upon their acts of creativity and response. The factor that binds the poet's address to the reader's response is the 'word'. The lucky phrase, the fortunate image, the arrested moment,... all these result from the miraculous union of choice and recognition.

In my view, the beauty of Makhdoom's poetry is in his feel for the right word which has ever a searching fingertip on the pulse of the idiom as well as the pulse of his times. His magic rests on his being able to fall upon the right word and tone. The unexpected image, accompanied often by the breaking of cliches and moulds is what sends a thrill in the hearts of the sensitive reader. Makhdoom is known to possess this magic in all the forms like Ghazals, Nazm, and long Free Verse etc. In my opinion, Makhdoom's genius lies in the use of minimalism to wonderful effect. What is minimalism? It is the effect of catching, through the most sensitive language, the sudden pain, the unexpected cloud drench, the involuntary sigh that escapes untutored. Take the long poem TOOR. This poem is full of images tailored to recreate a nostalgic moment of the past in some half dozen will made stanzas. The last couplet creates a telling finale, an inspired closing and a final drop into timeless and endless pathos.

dominant designs of his emotional and intellectual growth. He seems to shift his poetic voice and idiom each time a new emotional and expressive phase overtakes him. Critics has remarked on three distinctive phases marked out by his three volumes of work. Each phase in his life yielded different pastures for his talent to thrive on. The clearly different poetic voice in each of the three volumes of poetry expresses the different preoccupations of the moment in the poet's life. In his Preface to his second volume of verse, Makhdoom comments on the 'change' that occurred in his own evolution as a poet. As he says, change is an inevitable part of growth. It reflects the evolution of the persona of the poet in response to his personal growth as well as the currents flowing around him. In Makhdoom the change appears to be vast and yet it is easy to see that in spite of the shift in the poetic voice, the essential individual remains unchanged. In effect then, three phases are not different at all but three modes of self expression. The poems in the three volumes intrinsially carry the stamp of the same imagination.

In speaking of Makhdoom's talent and unique style, I am tempted to use a set of oxymorons: there is a timeless currency, a space less localization and dynamic stasis in the poetry of Makhdoom. Firmly grounded in the current social movements of his times, Makhdoom Mohiuddin was yet a poet who restlessly searched for the right word, the 'mot juste' to give verbal shape to his teeming mind. He also is a poet capable of a duality-a public personality hiding a private person; or, a sensitive poet exploring a universal Truth through a current idiom. Both are right and both have been validated in his poetry.

exclusions. It is up to the evaluators to pay judicious attention and prevent many natural talents to wither under the established heavy weights by virtue of their sheer weightiness.

Makhdoom was a natural and spontaneous poet. In his forms he borrowed from the fashionable trends of Free Verse, the long narrative poem, the Nazm, and of course the Ghazal. His themes, his humanistic zeal and even his love poetry are not perhaps unique. All these three facets of Makhdoom's poetry were fashioned out of the forms and themes floating around in the youthful times invigorated by the excitement of the ideals of freedom of spirit and subjective, deeply felt expression. The heady self consciousness and the reveling of the creative personality in its own sparkle were the two gifts Makhdoom possessed and he used them with relish. He knew and enjoyed the fact that he was the toast of the day. His ego was the ego of a man who had the honesty in recognizing his own talent as much as he did others'.

Makhdoom was lucky too. He lived in an era which was as yet innocent of the art of moral policing and public censorship of art forms and artists. The artist in Makhdoom enjoyed the liberty to be an iconoclast, a breaker of cliches, a free spirit, a Birbal who could mock at kings and enjoy clemency full hilt. Makhdoom's poetry glitters with cheeky comment on all 'establishment'; be it of formal rigidity, thematic constraints or norms of privacy. Like Dickinson he cocks an eye at the world and its stuffy standards with irrverence though never unfeelingly. For, Makhdoom was a humane poet with the zeal and personal anguish of the social servant.

Makhdoom's total poetic enterprise takes its inspiration from the

Prof. Amina Kishore

Head, Dept. of English, MANUU, Hyderabad

MAKHDOOM MOHIUDDIN AS A MINIMALIST POET

Makhdoom was a glowing flame as also cool drops of dew
He was the call of revolution as also the soft tinkling of payal
He was knowledge, he was action, he was wisdom
He was the gun of the revolutionary guerilla and also sitar
He was the odour of the gun powder and also the fragrance of Jasmine.

Mulk Raj Anand

Makhdoom was a man of many parts ... revolutionary, free thinker, sparkling conversationalist, friend, guide and model. He strode acrosss the lives and visions of his contemporaries earning respect of his contemporaries and the adulation of younger sets of aspiring poets and connoisseurs of refined thought. His work was as varied and as eclectic as his personality was; and his personality was truly fed by the wave of liberalism and bold gesture of his times. So what was so unique about Makhdoom? Makhdoom's choices of poetic form and style, his shifts in not only the poetic content but also the poetic medium and formal structures indicate a restless spirit..., the eternal seeker for the new and the yet newer.

Living in a feudal, culturally vibrant set up of the Hyderabad of his times, he yet joined forces with the poetic voices across India and across the whole world. His genius fed on the rich menu of European and post modern ideals of free thought and dignity of the individual ideology, his early work, his chosen poetic forms as well as his themes justify this inclusion. The Faiz likeness, the Sardar Jafri Parallels, the Sajjad Zaheer similarities etc., owe themselves to a consciously sought out membership of a then famous elitist coterie. It was a heady time for the young generation of Indian poets. In the words of another committed great of another great era in another context

Bliss was it then to be alive
But to be young was very Heaven.

- *Wordsworth*

Urdu poetry can unabashedly boast of having contributed the largest number of the greats of the progressive movement in India, compared to any other Indian language.

Makhdoom was not prolific by the standards of a Jafri or a Faiz, considering the meagerness of his literary output. He was also not exactly mainstream, being rather region bound in his actual outreach. In elitist literary critical circles Makhdoom did tend to occupy the status of a poet who also ran. I do not wish to battle this conviction which is based on nothing but observable facts. Elitism and mainstream are cultures which get mostly imposed through Institutionalisation and formal training systems. Canon formation makes it even more difficult to alow new entries. Canons validate the later artists through comparisons but in the process such icons also ten to perpetuate harsh

Contents

1. Message -

Dr. P. Prakash - 289

2. Makhdoom-As a minimalist poet

Prof. Amina Kishore - 288

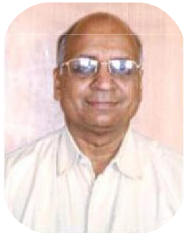

Dr. P. Prakash
Registrar, MANUU

MESSAGE

On the occasion of decennial celebrations of Maulana Azad National Urdu University and the birth centenary celebrations of the eminent poet and freedom fighter, Makhdoom Mohiuddin, the Centre for Urdu Language, Literature and Culture, MANUU is publishing a book entitled "***Makhdoom - Shair-e-Nabz Shanas"*** with selected thesis presented by the eminent scholars and academicians at the National Seminar organized by the Centre on 23rd April 2008.

Trust this book will be helpful to Students, Scholars and Academia in particular.

I wish the Editor of the Book and the staff of the Centre every success in their academic endeavours.

Signature

Maulana Azad National Urdu University

Decennial Celebration of Foundation Day

"Ek Shaam-Makhdoom Ke Naam "

Organized by

Centre for Urdu Language, Literature & Culture

Chief Guest

Mr. Mohd. Ali Shabbir, *Minister for Energy & Minority Welfare, Govt. of A. P*

Guest of Honour

Prof. Shamim Jairajpuri, *Founder & FormerVice-Chancellor, MANUU*

Presided Over By

Prof. A. M. Pathan, *Vice-Chancellor, MANUU*

You are Cordially Invited

Date : 24-04-2008

Time : 6:00 p.m.

Venue : CULLC Central Hall, MANUU Campus, Gachibowli, Hyderabad - 500 032

Phone No. : 040-23008359 / 60

"Shaam-e-Naghma"

Programme

☆ Welcome Address by
Prof. K. R. Iqbal Ahmed, *Pro Vice-Chancellor, MANUU*

☆A Brief Report of MANUU by
Dr. P. Prakash, *Registrar,* *MANUU*

☆ Address by Guest of Honour
Prof. Shamim Jairajpuri, *Founder & FormerVice-Chancellor, MANUU*

☆Presentation of Bouquet & Memento by
Prof. A. M. Pathan, *Vice-Chancellor, MANUU*

☆Address by Chief Guest
Mr. Mohd. Ali Shabbir, *Minister for Energy & Minority Welfare, Govt. of A. P*

☆ Presidential Address by
Prof. A. M. Pathan, *Vice-Chancellor, MANUU*

☆ **Kalam-e-Makhdoom**: Presented by
Singers of Hyderabad:
☆ Mr. Vitthal Rao ☆ Smt. Jasbir Kaur ☆ Mr. Khan Ather
☆ Mr. Ruknuddin & ☆ Ms Poorva Guru Sharma
Accompaying artists:
☆ Sitar - Ustad Mustafa Ali Khan
☆ Tabla - Mr. Mohd. Najamuddin Qadri Jaweed &
☆ Harmonium - Pandit Ratanlal Sharma

☆ Vote of Thanks & Convened by: **Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed**, *Dy. Director & I/c CULLC, MANUU*

☆☆☆

First Session : 11.45 a.m.

Preside over by : **Prof. Sadiq-ur-Rahman Kidwai**

Former Professor, Jawaharlal Nehru University, New Delhi

Guest of Honour: Prof. Sayeda Jafar, Former Head, Dept. of Urdu, OU & HCU

Presentation of Papers :

☆ Dr.Md.Naseemuddin Farees, *Reader Urdu Dept., MANUU*

☆ Prof. Fatima Parveen, *Dept. of Urdu, OU*

☆ Prof. Khalid Sayeed, *Head Dept. of Urdu, MANUU*

☆ Prof. Rahmat Yousuf Zai, *Former HoD Urdu, HCU*

☆ Prof. S. A. Wahab Qaiser, *Professor, DDE, MANUU*

Convene by: Dr. Nikhath Jahan, *Reader Distance Edn., MANUU*

Second Session: 2:00 p.m.

Preside over by : Mr. Mujtaba Hussain

Renowned Humorist

Chief Guest: Dr. Raj Bahadur Gaud, *Freedom Fighter*

Paper presenters

☆ Dr. Askari Safdar, *Reader & Head, Dept. of Urdu, Hussaini Alam Girls Degree College*

☆ Prof. Majeed Bedar, *Dept. of Urdu, OU*

☆ Prof. Rehana Sultana, *Head DWE & I/c Dept. of CWS, MANUU*

☆ Prof. Baig Ehsas, *Head, Dept. of Urdu, HCU*

☆ Prof. Amina Kishore, *Head Dept. of English, MANUU*

☆ Prof. Suleman Ather Jaweed, *Former Head, Dept. of Urdu, S V Univ.*

☆ Prof. Ashraf Rafee, *Former Head, Dept. of Urdu, OU*

☆ Dr. Aqeel Hashmi, *Former Head, Dept. of Urdu, OU*

Convene by: Dr. Shamsul Huda Daryabadi, *Lecturer Urdu Dept., MANUU*

Maulana Azad National Urdu University

Decennial Celebration of Foundation Day

"Ek Shaam-Makhdoom Ke Naam "

Sham-e-Naghma

Organized by

Centre for Urdu Language, Literature & Culture

Maulana Azad National Urdu University

Decennial Celebration of Foundation Day

Cordially invite you

One-day National Seminar On

"Makhdoom - Shair-e-Nabz Shanas"

Organised By

Centre For Urdu Language, Literature & Culture

Maulana Azad National Urdu University

Decennial Celebration of Foundation Day

"Makhdoom - Shair-e-Nabz Shanas"

One-day National Seminar

Organized by

Centre for Urdu Language, Literature & Culture

Date : Wednesday, 23-04-2008 Time : 10.30 a.m.

Venue: University Conference Hall

You are Cordially Invited for

Inaugural Session Programme

☆ **Welcome Address** by
Prof. K. R. Iqbal Ahmed, *Pro Vice-Chancellor, MANUU*

☆**Presentation of Bouquet & Memento** by
Prof. A. M. Pathan, *Vice-Chancellor, MANUU*

☆ **Inaugural Address** by Prof. Mohd. Shameem Jairajpuri,
Founder & FormerVice-Chancellor, MANUU

☆ **Presidential Address** by,
Prof. A. M. Pathan, *Vice-Chancellor, MANUU*

☆ **Vote of Thanks**: Dr. P. Prakash, *Registrar, MANUU*

☆ **Convenor**: Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed, *Dy. Director & I/c*
Centre For Urdu Language, Literature & Culture, MANUU

*** Tea Break ***

Chief Patron

Prof. A. M. Pathan

Vice-Chancellor

Patron

Prof. K. R. Iqbal Ahmed

Pro Vice-Chancellor

Publisher

Dr. P. Prakash

Registrar

Editor

Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed

Dy. Director & I/c

Centre For Urdu Language, Literature & Culture

© All right reserved for Maulana Azad National Urdu University

Issue No. - 4

Book : **Makhdoom - Shair-e-Nabz Shanas**

Published : **May, 2008**

Quantity : **300**

Publisher : **Dr. P. Prakash, Registarar**
Maulana Azad National Urdu University

Editor : **Dr. Md. Shujath Ali Rashed, *Dy. Director & I/c***
Centre For Urdu Language, Literature & Culture
Maulana Azad Natioal Urdu University

Composing & Printing: Impressions Quality Printers,Hyderabad

Assisted : **Ms. Amina Anjum**
Md. Wasim Raja

Address : **Centre For Urdu Language, Literature & Culture**
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032
Phone Nos.: 040-23008359/60

Makhdoom-Shair-e-Nabz Shanas

Publisher

Dr. P. Prakash

Registrar

Editor

Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed

Dy. Director & I/c

Centre For Urdu Language, Literature & Culture

MAKDOOM : SHAIR-E-NABZ SHANAS

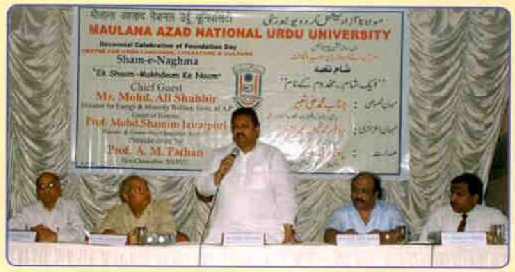

Editor

Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed, *Dy. Director & I/c*
Centre For Urdu Language, Literature & Culture

Makhdoom - Shair-e-Nabz Shanas

Editor

Dr. Mohd. Shujath Ali Rashed

Dy. Director & I/c

Centre For Urdu Language, Literature & Culture

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500 032